جاری کردہ
سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ماہنامہ
ترجمان القرآن

۱۹۹۴

مُدیر: خرم مُراد

اِدارۂ ترجمان القرآن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

خرّم مُراد

پاکستان میں سیاسی محاذ آرائی روز بروز شدید ہوتی جا رہی ہے۔ ایک عام آدمی بھی دیکھ سکتا ہے کہ بحران کی یہ صورت حال زیادہ عرصہ اس طرح نہیں چل سکتی۔ ملک تباہ و برباد ہو رہا ہے' اور اگرچہ ۱۹۷۱ کی طرح ختم نہ ہو' پھر بھی غالب امکان یہی ہے کہ کوئی ایسا "غیر معمولی" اقدام کیا جائے' جس طرح ماضی میں برابر کیا جاتا رہا ہے' جو بظاہر بحران کو ختم کر دے لیکن فی الحقیقت ایک اور سنگین تر بحران کی بنیاد رکھ دے۔ بالکل ممکن ہے کہ "معین قریشی" ٹائپ حکومت اب زیادہ عرصہ کے لیے مُسلط کر دی جائے۔ کسی تحریک کا چلنا بہت دشوار ہے اور اگر چل بھی جائے تو مقتدر قوتوں کی حمایت کے بغیر فریقِ مخالف کو اقتدار واپس نہیں دلا سکے گی۔

جو بات ہر عام آدمی کو نظر آ رہی ہے' وہ برسرِپیکار فریقین کو کیوں نظر نہیں آ رہی' یا ہوسِ اقتدار نے ان کو اندھا کر رکھا ہے؟ ایک فریق کی رَوش تو کسی طرح سمجھ میں آتی بھی ہے۔ جب ہم اقتدار میں نہ رہے اور وزارتِ عظمیٰ ہم سے چھن گئی تو' کچھ بھی پیش آ جائے' لیکن دوسرا فریق ملک نہ چلانے پائے اور وہ بھی اقتدار سے محروم ہو۔ پھر جس انداز میں جمی جمائی مسندِ اقتدار ان کے نیچے سے کھِسکا دی گئی تھی' اس کا داغ بھی تڑپاتا ہو گا' یہ بھُول کر کہ وہ خود کس طرح اقتدار پر قابض ہوئے تھے' اور کورٹ کے فیصلہ کے بعد انھوں نے پنجاب میں کیا حماقتیں کی تھیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے ذرا بھی مفاہمت کی رَوش اختیار کی' تو جو فریق برسرِ اقتدار ہے اس کی کرسی اور مضبوط ہو گی۔ ملک پر کچھ بھی گزر ے' پھر وہ اس "گناہ" کا ارتکاب کیوں کریں۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ بھاڑ میں جائے ایسی جمہوریت' بھاڑ میں جائے ایسا آئینی حق۔

لیکن جس فریق نے گذشتہ سال کی اکھاڑ پچھاڑ کے نتیجہ میں اقتدار سنبھالا ہے' اس کی روش

تو بالکل ناقابل فہم ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ خود کو جلد از جلد اقتدار سے بے دخل کرنے کا مشن لے کر برسراقتدار آئے ہیں۔ نہ حکومت کی کوئی سمت ہے‘ نہ واضح اہداف‘ نہ ملک کے پیچیدہ مسائل کا سوچا سمجھا حل۔ بین الاقوامی فورم میں کشمیر کا مسئلہ جس موثر انداز میں پیش کیا گیا اس کا اعتراف نہ کرنا بخل ہو گا‘ لیکن فوراً ہی بعد سکھوں کے مقابلہ میں راجیو گاندھی کی مدد کے اعتراف‘ اور اب اقوام متحدہ میں کشمیر قرارداد کی واپسی نے سب کیا دھرا برابر کر دیا۔ ابھی وقت تھوڑا گزرا ہے‘ اس لیے ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ سرحد میں جو کارروائی وہ کر رہے ہیں وہ اسی طرح ان کے اقتدار کے تابوت کی آخری کیل ثابت ہو گی جس طرح گذشتہ حکومت کی پنجاب میں کارروائی ان کے لیے ہوئی‘ لیکن یہ بالآخر ان کے اقتدار کے خاتمے میں اہم حصہ ادا کرے گی۔ ماں سے جنگ بھی جاری ہے۔ جب اتنے محاذ کھلے ہوئے ہوں تو ملک کے انتہائی پیچیدہ مسائل حل کرنے کی فرصت کہاں سے ملے۔

کسی مفاہمت اور تعاون کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا‘ تحمل و رواداری بھی دُور کی بات ہے‘ جو زبان استعمال ہو رہی ہے اسے دیکھیے تو سَر شرم سے جھک جاتے ہیں۔ کشت و خون کی دھمکیاں ہیں‘ کھلی کھلی گالیاں ہیں‘ "ہم بدمعاش ہیں" کے نعرے ہیں۔ افغانستان میں خانہ جنگی کی مذمت بجا‘ لیکن پاکستان کے باہم دست بگریباں لیڈروں کے پاس بھی‘ الفاظ کے بجائے‘ کلاشنکوف‘ راکٹ اور ہوائی جہاز ہوتے‘ اور اپنے اَرمان پورے کرنے کے لیے اسمبلیوں اور پریس کے بجائے میدان‘ تو ہمیں یقین ہے کہ وہاں سے بدتر خون ریزی یہاں ہوتی‘ اور شاید لوگ ایک دوسرے کو کچا ہی چبا جاتے۔

نظام کی بقا اداروں کے استحکام پر منحصر ہے۔ جن کا اقتدار اداروں کے تحفظ کے ساتھ وابستہ ہے وہ بھی ان کو غیر مستحکم کرنے میں مصروف ہیں‘ جو اقتدار چھینے جانے پر تلملا رہے ہیں وہ تو ان کو تباہ کرنے پر تلے ہی ہوئے ہیں۔ چنانچہ اسمبلیاں قانون سازی کے بجائے جنگ و جدل کے اکھاڑے بن گئی ہیں۔ بیورو کریٹ کہیں بہتی گنگا میں ہاتھ دھو رہے ہیں‘ کہیں بے یقینی کے عالم میں اِدھر سے اُدھر لڑھکائے جا رہے ہیں۔ جو فریق عدالتوں میں ہارتا ہے‘ وہ ان کو بُرا بھلا کہنے پر اُتر آتا ہے۔

یہ نتیجہ ہے اس بات کا کہ دونوں گروہوں نے اپنے اقتدار اور قوم کے مفاد کو ہم معنی سمجھ لیا ہے۔ پانچ سال کا تجربہ بتا رہا ہے کہ اب کوئی فریق دوسرے کو کسی قیمت پر حکومت نہیں کرنے دے گا۔ لیکن کوئی دوسرے کو فی الحال مٹا بھی نہیں سکتا۔ پھر انجام کیا ہو گا؟ یہ سوال ہر دردمند

پاکستانی کو پریشان کر رہا ہے۔

ویسے غور کیجیے تو ہمارا پاکستان مختلف پہلوؤں سے ایک خوش قسمت ملک ہے۔ قدرتِ الٰہی نے اسے بڑی فیاضی سے نوازا ہے۔ ہمارے لوگ توانا و جفاکش' جذبوں سے معمور اور بہترین انسانی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ کیا کام ہے جو وہ نہیں کر سکتے: جو پھل کبھی نہ ہوئے ان کے لہلہاتے باغ انھوں نے لگا دیے' ایٹم بم انھوں نے بنا لیا۔ ہماری دھرتی' سونا اگلنے والے کھیتوں' وافر پانی' اور پٹرول و گیس سمیت ہر نوع کے قدرتی وسائل سے مالا مال ہے۔ وسط ایشیا' مشرق وسطٰی اور مشرقی ایشیا کے درمیان واقع' ہم ایک اہم اور منفرد اسٹرٹیجک مقام کے حامل ہیں۔ خود ملک کا وجود انسانی جذبوں اور قربانیوں اور خدائی عطا و بخشش کے توافق کا نتیجہ ہے' ورنہ دَورِ جدید کے تہذیبی نقشہ پر پاکستان جیسے نظریاتی ملک کی گنجائش کہاں نکل سکتی تھی۔

مگر بدنصیبی اس کی یہ ہے کہ نصف صدی ہو گئی ہے' آج تک اسے وہ لیڈر میسر نہیں آئے جو پاکستان کو بلدۂ طیبہ بناتے۔ اس کے برعکس' جس جس کے ہاتھوں زمامِ کار آئی' اس نے پاکستان کے قیمتی انسانی وسائل بے دردی کے ساتھ ضائع کیے' جوانوں کی جوانی' بوڑھوں کی فرزانگی' اہلِ علم کی دانش' محنت کاروں کی محنت' سب رائیگاں جاتی رہی۔ جو قدرتی وسائل موجود تھے وہ بھی ان کی غفلت کی نذر ہو گئے۔ کھیتوں کی پیداوار کم ہوتی گئی' پانی کی فراہمی گھٹتی گئی۔ جو نئے وسائل وجود میں آئے' ان کو انھوں نے دونوں ہاتھوں سے لوٹا اور ان پر داوِ عیش دینے میں مصروف رہے۔

لیڈروں سے ہماری مراد ہر شعبہ زندگی کے لیڈروں سے ہے' لیکن ان میں سیاسی لیڈر' جنرل اور بیوروکریٹ یقیناً سرِفہرست ہیں۔ یہ پاکستان کو بنانے والے ہوں یا بعد میں آنے والے۔ یہ سکندر مرزا' ایوب خاں' بھٹو اور بے نظیر ہوں' یا ضیاء الحق اور نواز شریف۔ اور اگر یہ بات تسلیم کی جائے کہ لوگوں کو ویسے ہی لیڈر ملا کرتے ہیں جس کے وہ مستحق ہوتے ہیں--- دودھ زہریلا ہو تو اوپر مکھن بھی زہریلا ہو گا--- تو عام لوگ بھی سارا الزام لیڈروں کے سر رکھ کے خود بری الذمہ نہیں ہو سکتے۔ خصوصاً سلطانی جمہور کے اس دَور میں' جب وہ خود انھی لیڈروں کو اپنا ہیرو بناتے ہیں' اور ان ہی کو ووٹ دینے کے لیے بیلٹ بکس تک چل کر جاتے ہیں۔

انھی لیڈروں کی بداعمالیوں کا نتیجہ ہے کہ آج اُمّت میں افتراق و انتشار کا بدترین نمونہ دیکھنا ہو تو اپنے پاکستان کو دیکھ لیجیے۔ وعدہ الٰہی--- وہ تمھیں گروہ گروہ کر کے ایک دوسرے سے لڑنے کا مزہ چکھا دے گا--- کا ظہور' سر کی آنکھوں سے دیکھنا ہو تو پاکستان پر نظر ڈال لیجیے۔

۲۵ سال پورے نہ ہوئے تھے کہ ملک دو ٹکڑے ہو گیا' اب مزید ۲۵ سال گزرنے کے بعد ہم پھر اسی مقام پر کھڑے ہیں۔ دوسری مارشل لائی حکومت کا آکسیجن ماسک جب سے اترا ہے' قوم مسلسل ایک کے بعد دوسرے بحران کا شکار ہے۔ پانچ سال میں تین الیکشن ہو چکے ہیں' لیکن سیاسی استحکام کا دُور دُور پتا نہیں۔ چنانچہ ملک کی کشتی بھنور میں پھنسی ہوئی ہے' اور اس کا تختہ تختہ ہل رہا ہے۔

ان لیڈروں نے ملک کو صرف شکست و ریخت' سیاسی محاذ آرائی اور عدم استحکام کے "تحائف" ہی نہیں دیے ہیں' بلکہ جس شعبہ زندگی کو لیجیے اس میں بگاڑ اور انحطاط ہی پیدا کیا ہے۔ ملک چلانے میں ان کی کارکردگی انتہائی گھٹیا اور ناقص رہی ہے۔

ان کے ایجنڈے پر سرفہرست معاشی ترقی رہی ہے۔ اس کو سرفہرست ہونا چاہیے تھا یا نہیں' یہ الگ بحث ہے۔ لیکن آج معاشی ترقی کا یہ عالم ہے کہ عام آدمی کی کمر گرانی کے بوجھ سے ٹوٹی جا رہی ہے' بیروزگار مارے مارے پھر رہے ہیں' بیرونی تجارت کا میزانیہ خسارہ میں ہے' قوم کا بال بال قرض میں جکڑا ہوا ہے' تقریباً آدھا بجٹ ان کی ادائیگی کی نذر ہو جاتا ہے' سڑکیں ٹوٹ پھوٹ رہی ہیں' نہریں خستہ حالت میں ہیں اور ان میں آب رسانی کی صلاحیت ختم ہوتی جا رہی ہے۔ چند لوگوں کے پاس پیسہ ہے' مگر حکومت کا خزانہ مفلس ہے۔ لوڈشیڈنگ سے اربوں روپے کی پیداوار کا نقصان ہوتا ہے' مگر کسی حکومت نے ایسے موثر اقدامات نہیں کیے کہ اس بربادی سے نجات کا سامان ہو جاتا۔

پاکستان جب بنا تو وہ خوراک میں خود کفیل تھا۔ ہمارے پڑوس میں' بھارت کا صوبہ پنجاب اب بھی اپنے سارے ملک کو غلّہ فراہم کر رہا ہے۔ مگر ہم عرصہ سے دانہ دانہ کے لیے باہر کے محتاج ہیں' اور اس ہی کی خاطر ان کے دام میں گرفتار بھی۔ کسان ہماری آبادی کا ۹۰ فی صد تھے' ان کی فلاح و بہبود کے لیے ان لیڈروں نے کچھ نہیں کیا۔ ان کے پاس نہ تعلیم ہے نہ علاج' نہ بجلی نہ پینے کے لیے صاف پانی' نہ سڑکیں نہ انسانوں کے رہنے کے لائق مکان۔

پاکستان کی سالمیت کی خاطر دین کی خاطر' اخلاق و کردار کی تعمیر کی خاطر' تعلیم پر کماحقُّہ توجہ دینے کی بات جانے دیجیے! سب جانتے ہیں کہ معاشی ترقی بھی تعلیم میں ترقی کے بغیر ممکن نہیں۔ لیکن تائیوان اور کوریا سے ہم کیا مقابلہ کریں' ہندوستان' چین اور انڈونیشیا جیسے ممالک سے بھی ہم کوسوں پیچھے ہیں۔ پرائمری اور سیکنڈری میں داخلہ کی شرح انڈونیشیا میں ۸۱ فی صد ہے' ہندوستان میں ۶۸ فی صد ہے' مگر پاکستان میں صرف ۲۹ فی صد ہے۔ ان پرائمری اسکولوں میں سے

بھی ایک بڑی تعداد چھتوں اور فرنیچر سے محروم ہے۔

لیکن اصل ستم یہ ہے کہ ان پاکستان چلانے والوں کو نہ اپنی قومی ضروریات کا احساس رہا ہے نہ دینی ضروریات کا۔ حال ہی میں پنجاب میں پرائمری سطح سے انگریزی کی لازمی تعلیم کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس سے زیادہ احمقانہ فیصلہ کیا ہو سکتا ہے۔ اس پر کروڑوں روپے خرچ ہوں گے۔ لاکھوں طلبہ میں سے جو پرائمری میں ہیں' ایک بہت قلیل تعداد ہے جو میٹرک تک پہنچ پائے گی۔ پھر میٹرک' انٹر اور بی اے' ہر سطح پر تقریباً ۷۰ فی صد تعداد امتحانات میں ناکام ہو کر باہر رہ جائے گی۔ بی اے اور ایم اے میں جہاں انگریزی جاننا ضروری سمجھا جا سکتا ہے' چند ہزار سے زائد طلبہ کی تعداد باقی نہ بچے گی۔ پھر یہ زرِکثیر کا ضیاع اور اس سے بڑھ کر انسانی قوتوں اور صلاحیتوں کا ضیاع کس لیے۔ انگریزی کی تعلیم کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں' لیکن اعلیٰ تعلیم تک پہنچنے والوں کے لیے اس کے خصوصی انتظامات کیے جا سکتے تھے۔

دفترِ خارجہ اور بیرونی ممالک میں ہمارے سفرا جس طرح وہاں اپنے لیے دوست پیدا کرنے میں' اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے میں' اس کا قائل کرنے میں' ہماری تجارت کو فروغ دینے میں' اور اپنے عیش و عشرت سے کچھ وقت بچا کر پاکستانیوں کی خبر گیری کرنے میں' بُری طرح ناکام ہیں' وہ محتاجِ ثبوت نہیں۔ کشمیر میں بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی پر اپنی قرارداد واپس لینے کی جو دلدوز خبر آج ہی آئی ہے' وہ صرف اسی سفارتی نااہلی کا نتیجہ ہے۔ اگر ہم چین' ایران اور سوڈان جیسے ممالک کو بھی اپنا ہم نوا نہ بنا سکے' یا پہلے سے ان کے نقطۂ نظر سے آگاہ نہ ہو سکے' تو سر پیٹنے کا مقام ہے۔ سوڈان کے دفترِ خارجہ کے ذمہ دار کے الفاظ میں: ایک سیکنڈ سیکرٹری ضرور آیا تھا' ہم نے تو اب تک قرارداد کا مسودہ بھی نہیں دیکھا۔ پھر تو قرارداد کا حشر یہی ہونا تھا۔

یہ منظرنامہ سیاسی عدم استحکام سے زیادہ تشویش ناک اور دل خراش ہے۔ اگر سیاسی استحکام نصیب بھی ہو جائے' لیکن ملک کو چلانے کے انداز و اطوار یہی رہیں' تو اس استحکام سے بھی کیا حاصل ہو گا۔ اس وقت تو ہر دردمند پاکستان کو اسی مسئلہ کا حل تلاش کرنا چاہیے اور اس حل کے لیے جو کچھ کر سکتا ہو وہ کرنے کے لیے کھڑا ہونا چاہیے۔

اصل مسئلہ نظام کا نہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ انتخابات اور مغربی جمہوریت سارے فساد کی جڑ ہیں' لیکن یہ نہیں بتاتے کہ ان کا وہ متبادل کیا ہے جس کے ذریعے حکمرانوں کا عزل و نصب عام مسلمانوں کی رائے اور مشورے سے ہو سکے۔ وہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس سسٹم میں بندوں کو گنا جاتا ہے' تولا نہیں جاتا۔ لیکن یہ نہیں بتاتے کہ اگر بندوں کو تولنے کا کوئی نظام وضع کیا

جائے تو تولنے کے باٹ کیا ہوں گے' ان باٹوں کو کون بنائے گا' ترازو کا پلڑا کس کے ہاتھ میں ہو گا' اور یہ سب کام کرنے والے لوگوں کا تعین کون کرے گا' اور کیسے کرے گا۔ کیا ترازو پر تولنے والے لوگ خود بخود ظہور پذیر ہو جائیں گے' یا خود اپنے کو اس مقام پر فائز کرلیں گے۔ پھر اگر وہ غلط باٹ بنائیں' اور تولتے ہوئے ڈنڈی مارنے لگیں' تو اس کا علاج کون کرے گا' اور کیسے کرے گا۔ بعض لوگوں کے نزدیک بس پارلیمنٹری نظام کو صدارتی نظام سے بدلنے کی ضرورت ہے اور سارے امراض کا مداوا ہو جائے گا۔ لیکن اس ملک کی زندگی اکثر و بیشتر تو انتخابات کے ذریعے منتخب پارلیمنٹری حکومتوں کے تحت نہیں گزری ہے' بلکہ ایسے افراد کے تحت گزری ہے جو دستوری صدر سے بھی زیادہ بااختیار تھے' اور جنھوں نے باٹ بنانے اور تولنے کے منصب پر بھی خود ہی اپنے کو فائز کرلیا تھا۔ لیکن وہ تو خود اپنا استحکام یقینی نہ بنا سکے' ملک کو مستحکم کیسے بناتے۔

بعض لوگ مسلسل سیاسی لیڈروں کو وعظ و نصیحت کر رہے ہیں' ان کو آنے والے خطرات سے آگاہ کر رہے ہیں۔ وعظ و نصیحت اچھی چیز ہے' اسے جاری ہی رہنا چاہیے' کہ شاید کسی کے دل میں بات اتر جائے۔ لیکن مسلسل تجربہ بتا رہا ہے کہ کوئی گروہ بھی سبق سیکھنے کو تیار نہیں' نہ اپنے انجام سے' نہ اپنے پیش رووں کے انجام سے۔ ان پر قرآن کی یہ آیت صادق آتی ہے:

أَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُونِ يَمْشُونَ فِي مَسَاكِنِهِمْ (طٰہٰ ۲۰ : ۱۲۸)

پھر کیا ان لوگوں کو (تاریخ کے اس سبق سے) کوئی ہدایت نہ ملی کہ ان سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں جن کی (برباد شدہ) بستیوں میں آج یہ چلتے پھرتے ہیں؟

اصل مسئلہ انسان کا ہے۔ جس انسان کے دل کو ہوائے نفس گھن کی طرح چاٹ گئی ہو' اور جسے حُبِّ دنیا کا کینسر لاحق ہو' وہ ہر نظام کو تباہی سے دوچار کردے گا۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ قوم میں جو افراد بھی ذاتی مفاد سے بالاتر اس ملک کو صحیح راستہ پر لے جانے کے آرزومند ہیں' وہ وعظ و نصیحت سے آگے بڑھیں اور ملک و قوم کو بچانے کے لیے عمل کے میدان میں اتریں۔ ہمیں یقین ہے کہ اب بھی اس ملک میں ایسے لوگوں کی ایک کثیر اور وسیع تعداد موجود ہے۔ لیکن وہ بکھری ہوئی اینٹوں کی طرح ہیں۔ وہ کسی تعمیرِنو کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔ یہی سب لوگ اگر مجتمع ہو جائیں' ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہو جائیں' تو وہ ایک بہت بڑی سیاسی قوت بن سکتے ہیں۔ وہ تمام اہم اور غیر اہم اختلافات کے باوجود ایک جامع قومی اور دینی پروگرام پر جمع ہو سکتے ہیں۔

ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ وہ عارضی مصلحتوں کی خاطر ان کھوٹے سِکّوں کی مدح و توصیف' ان کی حمایت اور ان کو ہیرو بنانے کی روش ترک کر دیں' جن کی حقیقت وہ ہم سے بہتر جانتے ہیں۔ اگرچہ اس کے معنی یہ بھی نہیں کہ ان سے بلاضرورت محاذ آرائی کریں' یا اپنے مقاصد کی طرف پیش رفت کے لیے ضروری ہو تو ان سے ہاتھ ملانے سے بھی انکار کر دیں۔

یہی وقت کی پکار ہے' یہی ہم ہر دردمند پاکستانی تک پہنچا رہے ہیں۔

جماعت اسلامی پاکستان کے ارکان نے محترم قاضی حسین احمد کو ایک دفعہ پھر امیرِ جماعت منتخب کر لیا ہے۔ یہ معمول کا انتخاب نہ تھا۔ ابھی ڈیڑھ سال پہلے' اکتوبر ۱۹۹۲ میں' پانچ سالہ مدت پوری ہونے کے بعد بھی ارکان نے ان کو اس منصب کے لیے منتخب کیا تھا۔ ۱۹۹۳ کے ملک گیر انتخابات میں جو کچھ پیش آیا' اس کے بعد اگر ان کی ذات ہدفِ تنقید و احتساب بنی تو ایسا ہونا بالکل بجا تھا۔ جماعت اسلامی' دوسری جماعتوں کے برعکس' اپنی قیادت کے بارے میں انتخاب و احتساب کی شاندار روایات کی حامل رہی ہے۔ لیکن اندر اور باہر کے بعض حلقے اس تنقید میں اخلاقی و دستوری حدود سے تجاوز کر گئے۔ انھوں نے مسلسل ایک طرف تو ان پر یہ اتہام لگایا کہ وہ دستور اور شوریٰ کے فیصلوں کی خلاف ورزی کرتے رہے ہیں' دوسری طرف انھوں نے یہ بھی کہنا شروع کیا کہ وہ ارکان کا اعتماد کھو چکے ہیں اور کرسی سے چمٹے ہوئے ہیں۔ ان حالات میں انھوں نے یہ سمجھا کہ ان کے سامنے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں کہ وہ ارکان کو ایک دفعہ پھر امیرِ جماعت کا انتخاب کرنے اور اس طرح اپنی رائے کا اظہار کرنے کا موقع دیں۔ چنانچہ انھوں نے مرکزی شوریٰ کے واسطے سے ارکان جماعت کے نام ایک خط لکھا' اور امارت کے منصب سے مستعفی ہو گئے۔ یہ قطعاً" ان کا ذاتی فیصلہ تھا۔

جماعت کا دستور اس معاملے میں خاموش ہے کہ استعفیٰ منظوری کا محتاج ہے یا نہیں' اور ہے تو اس کا طریقہ کیا ہو گا۔ چنانچہ مجلسِ شوریٰ نے' جو تعبیرِ دستور کا مکمل اختیار رکھتی ہے' سیر حاصل بحث کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ امیرِ جماعت کے استعفیٰ دیتے ہی اس کا منصب خالی ہو جاتا ہے' اور اس کا استعفیٰ کسی منظوری کا محتاج نہیں۔ یہ تعبیر کرنے کے بعد' پوری مجلس نے عارضی امیر کے انتخاب میں حصہ لیا اور کثرت رائے سے محترم چودھری رحمت الٰہی کو منتخب کر لیا۔ مجلسِ شوریٰ نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ محترم قاضی حسین احمد کا ارکان کے نام خط' اخبار میں بھی شائع کرا دیا جائے اور ارکان کو بھی ارسال کیا جائے۔ انھوں نے خود نہ یہ خط پریس کے حوالے کیا نہ ارکان

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مدیر : خرم مراد

جلد ۱۲۰ | اپریل ۱۹۹۴ شوال ۱۴۱۴ | عدد ۴

فہرست مضامین

تک براہِ راست پہنچنے کی کوشش کی۔ اس مرحلے پر بھی بعض ارکان نے اعتراض اٹھایا کہ اس خط سے امیدواری کی خواہش ظاہر ہوتی ہے' مگر مجلس نے یہ اعتراض مسترد کر دیا۔

اس انتخاب میں ۷۹۹۴ ارکان نے ووٹ ڈالے' اور ان میں سے ۶۰۹۳ ارکان یعنی ۷۶ فی صد نے محترم قاضی حسین احمد کے حق میں رائے دی۔ ملحوظ رہے کہ ۱۹۹۲ کے انتخاب میں ۷۴۱۶ ارکان نے ووٹ ڈالے تھے' اور ان میں سے ۵۷۲۹ ارکان یعنی ۷۷ فی صد نے محترم قاضی حسین احمد کے حق میں رائے دی تھی۔

یہ بات بھی علم میں رہنا چاہیے کہ ۱۹۸۷ میں جب محترم میاں طفیل محمد کا ۱۵ سالہ دورِ امارت ختم ہوا تھا' تو ارکان کی تعداد ۵۵۲۵ تھی' اور اب یہ تعداد ۸۴۱۶ ہے۔ گویا محترم قاضی صاحب کے دورِ امارت میں اوسط سالانہ اضافہ ۸ فی صد ہوا جبکہ محترم میاں صاحب کے ۱۵ سالہ دورِ امارت میں ارکان کی تعداد میں اوسط سالانہ اضافہ کی شرح ۷ فی صد تھی۔

بعض حلقوں میں یہ اعتراض اٹھایا گیا ہے کہ مجلسِ شوریٰ نے ارکان کے سامنے ان کا نام تجویز کر کے غلطی کی' اس لیے کہ وہ دستور کے تحت اس منصب کے اہل نہ تھے۔ اگر کوئی شخص مجلس شوریٰ یا کسی فرد کے بارہ میں ایسی رائے رکھتا ہے تو کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں۔ افراد غلطیاں بھی کر سکتے ہیں اور پسند و ناپسند بھی ہو سکتے ہیں۔ شوریٰ بھی انسانوں پر مشتمل ادارہ ہے' اور وہ غلطی کر سکتی ہے۔ لیکن بہرحال کسی فردِ واحد کو شوریٰ کے فیصلے کو منسوخ کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہے۔ فیصلہ کرنے والے ادارے جب فیصلہ کر دیں تو جماعتی نظم کی صلاح و سلامتی اس میں ہے کہ اس فیصلے کو تسلیم کیا جائے۔ اگر لوگ اجماع کے آگے سر نہ جھکائیں تو پھر فساد ہی فساد ہے۔ یہ بھی ملحوظ رکھا جائے کہ شوریٰ کے ارکان وہ ہیں جو محترم قاضی صاحب کے دورِ امارت سے پہلے رکنِ جماعت بنے تھے' اور ان میں سے تقریباً نصف تعداد وہ ہے جو ۱۹۸۵ میں بھی شوریٰ کی رکن تھی۔

ہم توقع رکھتے ہیں کہ جب ارکان نے اتنی یکسوئی سے اپنی رائے کا اظہار کر دیا ہے تو اب جماعت کے سب ہی خواہ امیر جماعت کے ساتھ تعاون کریں گے تاکہ وہ دستور کے مطابق جماعت کو چلا سکیں' اور یہی خواہ خود بھی دستور کے مطابق چلیں گے۔

رمضان ختم ہوتے' سفرِ حج شروع ہو گیا۔ اس مناسبت سے اس شمارہ میں حج کے موضوع پر جذبات انگیز تحریروں کا انتخاب پیش خدمت ہے۔ امید ہے کہ قارئین ان کو اپنے قلب و روح کی زندگی کے لیے بھی مفید پائیں گے' اور حاجی' حاجیوں تک بھی پہنچائیں گے۔

۶۰ سال پہلے

افسوس کے قابل ان "محققین" کا حال ہے جو عقل کو سوچنے' اور فکر کو حرکت کرنے کی زحمت دیے بغیر اپنی مذہبی تحقیقات کا یہ عجیب نتیجہ ظاہر فرمایا کرتے ہیں کہ "تمام مذاہب برحق ہیں۔" یہ جملہ اکثر ان لوگوں کی زبان سے سنا جاتا ہے جن کا دعویٰ ہے کہ ہم کوئی بات زبان سے نہیں نکالتے اور نہ تسلیم کرتے ہیں جب تک کہ اس کو میزانِ عقل میں تول نہ لیں۔ لیکن میزانِ عقل کا حال یہ ہے کہ وہ ان کی اس تحقیقِ انیق کو پرِکاہ کے برابر بھی وزن دینے کے لیے آمادہ نہیں ہے۔ جن مذاہب کو معاً برحق ہونے کی سند عطا کی جاتی ہے' ان کے اصول میں سیاہ اور سپید کا کھلا ہوا تخالف موجود ہے۔ ایک کہتا ہے کہ خدا ایک ہے' دوسرا کہتا ہے دو ہیں' چوتھا کہتا ہے بہت سی قوتیں خدائی میں شریک ہیں' پانچویں کی تعلیم میں سرے سے خدا کا تصوّر ہی موجود نہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ پانچوں سچّے ہوں؟ ایک' انسان کو خدائی کے مقام میں لے جاتا ہے' دوسرا' خدا کو کھینچ کر انسانوں کے بیچ میں اتار لاتا ہے' تیسرا' انسان کو عبد اور خدا کو معبود قرار دیتا ہے' چوتھا' عبد اور معبود دونوں کے تخیل سے خالی ہے۔ کیا صداقت میں ان چاروں کے لیے اجتماع کی گنجائش نکل سکتی ہے؟ ایک نجات کو صرف عمل پر موقوف رکھتا ہے' دوسرا نجات کے لیے صرف ایمان کو کافی سمجھتا ہے' تیسرا ایمان اور عمل دونوں کو نجات کے لیے شرط قرار دیتا ہے۔ کیا یہ تینوں بیک وقت صحیح ہو سکتے ہیں؟ ایک نجات کی راہ دنیا اور اس کی زندگی سے باہر نکالتا ہے۔ دوسرے کے نزدیک نجات کا راستہ دنیا اور اس کی زندگی کے اندر سے گزرتا ہے۔ کیا یہ دونوں راستے یکساں درست ہو سکتے ہیں؟ ایسے متضاد امور کو صداقت کی سند عطا کرنے والی شے کا نام اگر عقل ہے تو پھر جمع بین الاضداد کو محال قرار دینے والی شے کا نام کچھ اور ہونا چاہیے۔

(ترجمان القرآن ' "اشارات" سیدابوالاعلیٰ مودودیؒ' صفر ۱۳۵۳' اپریل ۱۹۳۴)

ہماری دعوت

ہم اپنی اس دعوت کو مختصر طور پر صاف اور سیدھے الفاظ میں بیان کرنا چاہیں تو یہ تین نکات پر مشتمل ہوگی :

۱۔ یہ کہ ہم بندگانِ خدا کو بالعموم اور جو پہلے سے مسلمان ہیں ان کو بالخصوص اللہ کی بندگی کی دعوت دیتے ہیں۔

۲۔ یہ کہ جو شخص بھی اسلام قبول کرنے یا اس کو ماننے کا دعویٰ یا اظہار کرے اس کو ہم دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی سے منافقت اور تناقض کو خارج کرے اور جب وہ مسلمان ہے یا بنا ہے تو مخلص مسلمان بنے اور اسلام کے رنگ میں رنگ کر یک رنگ ہو جائے۔

۳۔ یہ کہ زندگی کا نظام جو آج کل باطل پرستوں اور فُسّاق و فجّار کی رہنمائی اور قیادت و فرماں روائی میں چل رہا ہے اور معاملاتِ دنیا کے انتظام کی زمامِ کار جو خدا کے باغیوں کے ہاتھ میں آگئی ہے، ہم یہ دعوت دیتے ہیں کہ اسے بدلا جائے اور رہنمائی اور امامت، نظری و عملی دونوں حیثیتوں سے مومنین صالحین کے ہاتھ میں منتقل ہو۔

(ایک بندۂ خدا)

(عطیۂ اسرار)

گوشۂ حج

فہم حدیث

کلامِ نبویؐ کی صحبت میں

○

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں :
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: سب سے افضل عمل کون سا ہے ؟
حضورؐ نے فرمایا : اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان۔
پوچھا گیا : اس کے بعد ؟
فرمایا : اللہ کی راہ میں جہاد۔
پھر پوچھا گیا : اس کے بعد ؟
فرمایا : حجِ مبرور (جو ریا، سمعہ، رفث، اور فسوق سے پاک ہو)۔ (بخاری، مسلم)

اعمال میں، حج کا جو بلند مقام ہے، وہ واضح فرما دیا گیا ہے۔ چوٹی کا عمل تو جہاد فی سبیلِ اللہ ہے، جسے حضورؐ نے اونٹ کے کوہان سے تشبیہ دی ہے، اس کا درجہ ایمان کے بعد رکھا۔ لیکن اس کے بعد حج کو سب سے افضل عمل قرار دیا۔ افضلیت مختلف پہلوؤں سے ہوتی ہے۔ اس لیے مختلف احادیث میں افضل اعمال کے تعین میں اختلاف سے کوئی الجھن نہ ہونی چاہیے۔

حج میں صرف اللہ کی خاطر، ترکِ گھر ہے، ترکِ وطن ہے، ترکِ علائق ہے، خرچ ہے، سفر ہے، مشقت ہے، جدوجہد ہے، وقت لگتا ہے۔ اس لیے یہ جہاد فی سبیل اللہ کی طرح کا عمل ہے۔

○

حضرت عائشہؓ کہتی ہیں : میں نے کہا، اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم، ہماری نظر میں، جہاد سب سے افضل عمل ہے۔ تو کیا ہم جہاد نہ کریں ؟
آپؐ نے فرمایا : حجِ مبرور سب سے افضل جہاد ہے۔ (بخاری)

بخاری و مسلم کی روایت کے مطابق، حضرت عائشہؓ کی جہاد کی درخواست کے جواب میں

وضاحت کرتے ہوئے' آپؐ نے فرمایا: تمہارا جہاد' حج ہے۔ (بخاری' مسلم)

ابن خزیمہ کی ایک روایت میں' حضرت عائشہؓ کہتی ہیں:
میں نے پوچھا' اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم' کیا عورتوں پر جہاد فرض ہے؟
آپؐ نے فرمایا: ان پر وہ جہاد فرض ہے جس میں قتال نہیں: یعنی' حجِ مبرور۔

نسائی' حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
بوڑھے' کمزور' اور عورت کا جہاد' حج اور عمرہ ہے۔

وہ جو جہاد (قتال) میں شریک نہ ہو سکیں' یا جن پر جہاد فرض نہ ہو' ان کا جہاد حج ہے۔ گویا حج ایسا عمل ہے جو معذور کے لیے قتال فی سبیل اللہ کا بدل ہے۔

○

حضرت ابنِ عباسؓ بیان کرتے ہیں:
ایک آدمی عرفہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وقوف کر رہا تھا۔ وہ اپنی سواری سے گر پڑا' اور اس کے پاؤں تلے کچلا گیا۔
حضورؐ نے فرمایا: اس کو بیری کے پانی سے غسل دو' اسے اس کے اپنے کپڑوں کا کفن پہناؤ' لیکن نہ اس کا سر ڈھانپو' اور نہ اس کو خوشبو لگاؤ۔ یہ قیامت کے دن اٹھایا جائے گا' تو تلبیہ --- یعنی لبیک' اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ' حاضر ہوں' میرے رب' حاضر ہوں' کہتا ہوا اٹھے گا۔ (بخاری)

اللہ کو جو کچھ مطلوب ہے وہ ارادہ اور سعی ہے۔ آدمی اللہ کی راہ میں' اللہ کے حکم کی تعمیل کے لیے لبیک کہہ کر حاضر ہو جائے' کھڑا ہو جائے' نکل پڑے' تو اس کا اجر ثابت ہو جاتا ہے۔ یہ معاملہ ہر عمل کا ہے۔ یہاں حضورؐ نے میدانِ عرفات میں ہی فوت ہونے والے کو شہید کی طرح دفن کرنے کا حکم دیا' اور شہید کی طرح جو قیامت کے دن بہتے ہوئے خون کے ساتھ زندہ ہوگا' لبیک لبیک کہتے ہوئے کھڑے کیے جانے کی بشارت دی۔

○

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں:
میں نے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں: جس نے حج کیا' نہ جنسی خواہش کے پیچھے پڑا' نہ جانتے بوجھتے اللہ کی نافرمانی کی' وہ اپنے گناہوں سے ایسے پاک ہو جاتا ہے گویا آج

ہی اس کی ماں نے اسے جنا ہے۔ (بخاری ' مسلم)

حج کی عبادت سراسر عشق و محبت سے عبارت ہے۔ یہ جہاد کی طرح کا عمل ہے۔ اسی لیے اس کا اجر اتنا عظیم ہے' کہ گناہوں کی مغفرتِ عام کا مژدہ ہے۔ لیکن حج کو نفس کی خواہشات کی پیروی' اور اپنے مالک کی ڈھٹائی سے نافرمانی' سے پاک کرنا شرط ہے۔

○

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کی گئی ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب حاجی حلال مال خرچ کرکے' حج کے لیے نکلتا ہے' اپنا پاؤں رکاب میں رکھ کر کہتا ہے' لَبَّیکَ' اَللّٰھُمَّ لَبَّیکَ' تو آسمان سے پکارنے والا پکارتا ہے: لَبَّیکَ وَسَعْدَیکَ' تیری پکار اللہ نے سن لی' تیرے لیے خوش بختی ہے' تیرا زادِ سفر حلال ہے' تیری سواری حلال ہے' تیرا حج قبول کرلیا گیا' کہ گناہوں سے پاک ہے۔

لیکن جب وہ حرام مال خرچ کرکے نکلتا ہے' اور اپنا پاؤں رکاب میں رکھ کر' کہتا ہے' لبیک' تو پکارنے والا آسمان سے پکارتا ہے: نہ تیری سنی گئی' نہ تیرے لیے خوش بختی ہے۔ تیرا زادِ سفر حرام ہے' تیرا خرچ حرام ہے۔ تیرا حج گناہوں سے لدا ہوا ہے' قبول نہ ہوگا۔ (طبرانی ' اِصْبَہانی)

محبوب کے گھر جائے' لباس بھی حرام ہو' کھانا پینا بھی حرام ہو' زادِ سفر بھی حرام' سفر خرچ بھی حرام۔ ہر چیز محبوب کو ناراض کرنے والی ہو تو اس کی کہاں سنی جائے گی' کیسے جواب ملے گا!

○

حضرت ابوبکرہؓ کہتے ہیں:

قربانی کے دن (۱۰ ذوالحجہ کو منیٰ میں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے خطاب کیا' اور پوچھا: یہ کون سا مہینہ ہے؟

ہم نے کہا: اللہ اور اس کے رسولؐ خوب جانتے ہیں۔ یہ سن کر حضورؐ خاموش ہوگئے' یہاں تک کہ ہم نے سوچا کہ آپؐ اس مہینہ کا کوئی اور نام رکھیں گے۔

آپؐ نے فرمایا: کیا یہ ذوالحجہ نہیں ہے؟ ہم نے کہا: ہاں۔

پھر آپؐ نے پوچھا: یہ کون سا شہر ہے؟

ہم نے کہا: اللہ اور اس کے رسولؐ خوب جانتے ہیں۔ آپؐ نے پھر خاموشی اختیار کی' یہاں تک کہ ہم نے سوچا کہ آپؐ اس شہر کا کوئی اور نام رکھیں گے۔

آپؐ نے فرمایا: کیا یہ البلدۃ (المکہ) نہیں ہے؟ ہم نے کہا: ہاں۔
پھر آپؐ نے پوچھا: یہ کون سا دن ہے؟
ہم نے کہا: اللہ اور اس کے رسولؐ خوب جانتے ہیں۔ آپؐ نے پھر سکوت فرمایا' یہاں تک کہ ہم نے سوچا کہ آپؐ اس دن کا کوئی اور نام رکھیں گے۔
آپؐ نے فرمایا: کیا یہ قربانی کا دن نہیں ہے؟ ہم نے کہا: ہاں۔
آپؐ نے فرمایا: (آج کے دن سے) تمہارے خون' تمہارے مال' اور تمہاری عزتیں' تمہارے اوپر اسی طرح حرام ہیں' جس طرح تمہارے اس شہر میں' تمہارے اس مہینہ میں' تمہارے آج کے دن کی حرمت ہے' (کہ قتل و غارت اور آبروریزی حرام ہیں)۔
(دیکھو)' تم جلد ہی اپنے رب سے ملاقات کرو گے' اور وہ تم سے تمہارے اعمال کی باز پرس کرے گا۔ خبردار! میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا' کہ ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے لگو۔ (بخاری' مسلم)

حج کا حاصل زندگی میں' محبوب کی مخلوق کی حرمتوں کا پاس' اور ان سے اجتناب ہے۔ خون کی حرمت کا پاس تو بہت لوگ کرلیتے ہیں۔ مال کی حرمت کا لحاظ کم کرتے ہیں۔ رشوت' بغیر اجازت تصرف' دھوکہ سے حصول' یہ عام ہیں۔ لیکن عزت کے بارہ میں تو خیال بھی نہیں آتا کہ اس میں بھی' شراب اور سور کی طرح' غیبت' تمسخر' بدظنی' تجسس' ہمز' لمز' چغلی' حسد' کینہ جیسے اعمال حرام ہیں' جس طرح مکہ کا شہر' حج کا مہینہ اور حج کا دن حرام ہیں۔

○

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کہتے ہیں:
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجتہ الوداع کے موقع پر منیٰ میں قیام کیا' تاکہ لوگ آپؐ سے مسائل پوچھ سکیں۔ ایک آدمی حضورؐ کے پاس آیا' اور کہا: مجھے معلوم نہ تھا' میں نے قربانی کرنے سے پہلے سر منڈا لیا؟
حضورؐ نے فرمایا: کوئی حرج (گناہ) نہیں' اب قربانی کرلو۔
دوسرا آدمی آیا اور پوچھا: مجھے پتا نہ تھا' میں نے کنکریاں مارنے سے پہلے قربانی کرلی۔
حضورؐ نے فرمایا: کوئی حرج نہیں' اب کنکریاں مار لو۔
مختصر یہ کہ جس چیز کے بارہ میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ وہ پہلے ہو گئی یا بعد میں' آپؐ نے ایک ہی جواب دیا: اب کرلو' کوئی حرج نہیں۔ (مسلم)

ابوداؤد' حضرت اُسامہ بن شریکؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ تقدیم و تاخیر کے ہر سوال

کے جواب میں یہی فرماتے: کوئی گناہ نہیں۔ ہاں، جس نے مسلمان کی عزت پر ہاتھ ڈالا اور ظلم کیا، اس نے گناہ کیا، اور وہ ہلاک ہوگیا۔

حج کے مناسک میں ہر تقدیم و تاخیر سے کوئی نہ کوئی جرمانہ لگ جاتا ہے۔ لیکن ان شدید پابندیوں کے بارہ میں بھی حضورؐ جس حکمت کی تعلیم دے رہے ہیں وہ غور سے دیکھیے۔ اصل گناہ انسان کی عزت پر ہاتھ ڈالنا ہے، مخلوق پر ظلم ہے۔ آج حال یہ ہے کہ خود ان کبائر کا ارتکاب کرتے ہیں جن کو اب گناہ بھی نہیں سمجھا جاتا، دوسروں کی ان صغائر پر دارو گیر کرتے ہیں جن کو اب اصل دین سمجھ لیا گیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اونٹ نگل جاتے ہیں اور مچھر چھانتے پھرتے ہیں۔

○

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے خطاب کیا، اور فرمایا: لوگو، حج تم پر فرض کیا گیا ہے، پس حج کرو۔

ایک شخص (اقرع بن حابسؓ) نے پوچھا: یارسول اللہؐ کیا ہر سال؟

حضورؐ خاموش رہے، یہاں تک کہ انھوں نے یہی بات تین مرتبہ پوچھی۔

آپؐ نے فرمایا: اگر میں کہتا ہاں، تو ہر سال حج کرنا فرض ہو جاتا۔ اگر یہ ہر سال واجب ہو جاتا، تو تم اس پر عمل نہ کرپاتے، اس لیے کہ تم اس کی استطاعت نہیں رکھتے۔

پھر آپؐ نے فرمایا: جو چیز میں نہ بتاؤں، اسے مجھ پر چھوڑ دو۔ تم سے پہلے لوگ اس لیے تباہ ہوگئے کہ کثرت سے سوال کرتے تھے، پھر اپنے انبیا (کے احکام) کے بارہ میں اختلاف کرتے تھے۔ پس جب میں کسی بات کا حکم دوں، تو جتنا تمھارے بس میں ہو اس کی تعمیل کرو۔ اور جب میں کسی بات سے منع کروں تو اسے چھوڑ دو۔ (مسلم)

حج کے ضمن میں دین کی ایک بنیادی حکمت واضح ہوگئی۔ دین آسان ہے۔ جو حکم جیسا دیا گیا ہے اس پر عمل کرلو۔ سوالات کرکے تنگیوں اور دشواریوں میں اضافہ نہ کرو۔ جیسے بنی اسرائیل نے گائے کے بارہ میں کیا۔

جب سوالات کر کر کے مسائل کا بار بڑھایا جاتا ہے، تو دین پر عمل کا بوجھ استطاعت سے باہر ہونے لگتا ہے۔ سوال کرنے کے بجائے جتنا بس میں ہو اتنا کرلو، اللہ سے استغفار کرتے رہو، اس سے اچھی امید رکھو۔

جب مسائل کی کثرت ہوتی ہے، تو اختلاف بھی بڑھتا ہے۔

وَثِیَابَکَ فَطَہِّر

اور اپنے کپڑے پاک رکھو!

۱- اپنے لباس کو نجاست سے پاک رکھو

جسم و لباس کی پاکیزگی اور روح کی پاکیزگی لازم و ملزوم ہیں۔ ایک پاکیزہ روح گندے جسم اور ناپاک لباس میں نہیں رہ سکتی۔ اسی ہدایت کا ثمرہ ہے کہ حضورؐ نے انسان کو طہارتِ جسم و لباس کی وہ تعلیم دی ہے جو آج اس زمانے میں مہذب ترین قوموں کو بھی نصیب نہیں۔

۲- اپنا لباس صاف ستھرا رکھو

آدمی جتنا زیادہ میلا کچیلا ہو اتنا ہی زیادہ مقدس نہیں ہو جاتا۔ اللہ کے راستے کی طرف دعوت دینے والے کی ظاہری حالت بھی پاکیزہ اور نفیس ہونی چاہیے کہ لوگ اسے عزت کی نگاہ سے دیکھیں۔

۳- اپنے لباس کو اخلاقی عیوب سے پاک رکھو

تمہارا لباس ستھرا اور پاکیزہ ضرور ہو، مگر اس میں فخر و غرور، ریا، و نمائش، ٹھاٹھ اور شان و شوکت کا شائبہ تک نہ ہو۔

۴- اپنا دامن پاک رکھو

اپنے اخلاق کو پاکیزہ رکھو اور ہر قسم کی برائیوں سے بچو

(ماخوذ: سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، تفہیم القرآن، ج ۶، ص: ۱۴۳ — ۱۴۳)

دامن دل و اخلاق کو پاک رکھنا تو آپ ہی کا کام ہے
ہاں لباس پاک و صاف رکھنے میں آپ کی خدمت کیلیے ہم حاضر ہیں:

بیت اللہ

بیت اللہ : مرکزِ ارضی، تجلّی گاہِ ربّانی

سید مناظر احسن گیلانیؒ

مرکزِ ارضی

کثرتوں کا ارتکازی مجموعہ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، ہاتھی کا کوہ پیکر جثہ ہو یا برگد کے پھلوں کا خشخاشی تخم، ہر ایک میں ان کے بکھرے ہوئے اجزا کی یوستگی اور باہمی ارتباط کو قائم رکھنے کے لیے بھی، اور اپنے اپنے نوعی کمالات کو نشوونما اور ارتقا کے آخری مقام تک پہنچانے کے لیے بھی، ایک مرکزی نقطہ پایا جاتا ہے۔ اس مرکزی نقطہ کے وجود کو اگر اس سے نکال لیا جائے تو ایک طرف سارے سمٹے ہوئے اجزا بکھر جائیں گے، اور دوسری طرف بیرونی فیوض کو جذب کرکے ارتقا و نشوونما کے جس عمل کو یہ مرکزی نقطہ جاری رکھے ہوئے تھا وہ عمل بھی رک جائے گا۔

میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اس کو مثال سے سمجھیے۔ آم کی گٹھلی یا اسی قسم کے پھلوں کے تخم کو آپ نے دیکھا ہوگا۔ آم کا درخت اسی گٹھلی سے برآمد ہوتا ہے۔ پتّے، شاخیں، پھُول، پھَل کا ایک طوفان ہوتا ہے، جو اسی گٹھلی کی راہ سے اپنی اپنی شکلوں کے ساتھ، باہر نکل نکل کر آم کے درخت کا جز بنتا رہتا ہے۔ لیکن آم کی اسی گٹھلی کو چیریے، اس میں ایک چیز آپ کو نظر آئے گی جسے انکھوا کہتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ گٹھلی سے اس انکھوے کو نکال لینے کے بعد، خواہ کتنی ہی اچھی، نرم اور پاکیزہ زمین میں اس کو بویا جائے، اور چشموں کے کیسے ہی صاف و شفاف پانی سے اس کی آبیاری کی جائے، بجائے اس کے کہ اس گٹھلی سے پودا نکلے، گٹھلی سڑتی چلی جائے گی، تاآنکہ بالآخر سڑ سڑ کر اس کے اجزا مٹی میں مل کر اِدھر اُدھر غائب ہو جائیں گے۔

حاصل یہی ہے کہ گٹھلیوں کا یہی مرکزی نقطہ، وہ نقطہ ہے کہ دیکھنے میں خواہ کتنا بھی بے حیثیت اور معمولی چیز نظر آتا ہو، لیکن کسی درخت کے شجری نظام اور اس کے سارے آثار و نتائج کا حصول یقیناً اسی مرکزی نقطہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس کو نوچ کر گٹھلی سے اگر الگ کرلیا جائے تو سارے فیوض جن سے درخت کا تنا، اس کی ڈالیاں، شاخیں، پتّے، پھُول، پھَل مستفید

برائے اداراتی امور

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور ۵۴۵۷۰، فون نمبر ۸-۷۵۷۰۰۳۴، فیکس (۰۴۲) ۷۵۴۳۷۱۹

برائے انتظامی امور

رحمٰن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور ۵۴۰۰۰، فون نمبر ۷۲۳۴۰۴۳-۷۲۳۶۶۶۵، پوسٹ بکس نمبر: ۳۴۳

زر سالانہ بذریعہ منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ترجمان القرآن لاہور کے پتہ پر ارسال فرمائیں۔ کراس چیکس قابل وصول نہ ہوں گے۔

قیمت فی شمارہ -/۱۰ روپے ○ زر سالانہ: ۱۰۰ روپے (اندرون ملک)

عرب ممالک، خلیجی امارات و برصغیر: ۵۰۰ روپے، یورپ: ۶۰۰ روپے، امریکہ و آسٹریلیا: ۷۰۰ روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ملک عید محمد پرنٹرز لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن، اچھرہ، لاہور سے شائع کیا۔

اِدارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ اچھرہ لاہور (پاکستان)

ہوتے رہتے ہیں' ان کا قصہ ہی ختم ہو جائے گا۔

الغرض حیوانی و انسانی اجسام میں جو حیثیت قلب کی ہے' اور نباتی حقائق کے لحاظ سے جو اہمیت گٹھلیوں کے اس مرکزی نقطہ کی ہے' دل یہ پوچھتا ہے کہ مٹی کا یہ تودہ' جس کا نام زمین اور دھرتی ہے' جس سے علاوہ عناصر اور معدنی مرکبات کے نباتی' حیوانی' انسانی ہستیوں کی بے پناہ موجیں ابل رہی ہیں' ان ساری پیداواروں کے لیے زمین بھی اپنے اندر کیا کوئی ایسی چیز رکھتی ہے جسے ارضی فیوض و برکات کا مرکزی نقطہ ٹھہرایا جائے ؟ کیا اس کا بھی کوئی دل ہے' جس سے مختلف ارضی پیداواروں کی رگوں میں نشوونما اور ارتقا و بقا کا خون دوڑ رہا ہے ؟ یا یوں پوچھیے کہ یہ خاکی گٹھلی بھی اپنے اندر کیا کوئی ایسا انکھوا رکھتی ہے کہ اسی کے ساتھ ان ساری چیزوں کا قیام وابستہ ہو جو زمین سے پیدا ہو رہی ہیں' اور تمام خطرات کا مقابلہ کرتے ہوئے اس خاکی کرّے کی پشت پر نمایاں ہو ہو کر جسدِ ارضی پر اپنے اقتضائی کمالات کو حاصل کرتی چلی جا رہی ہیں ؟

نہ ماننے والوں سے ابھی بحث نہیں' لیکن جنھوں نے مانا ہے کہ

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ (المائدہ ۵ : ۹۷)

بنایا اللہ نے اَلکعبۃ کو' جو بیت الحرام ہے' سارے انسانوں کے قیام کا ذریعہ۔

اسی کی خبر ہے جو زمین کا' اور زمین میں جو کچھ ہے سب کا' پیدا کرنے والا ہے' بتایئے ان سوالوں کے جواب میں ایک مومن بالقرآن کی نظر "کعبہ" کے سوا کیا کسی دوسری چیز پر پڑ سکتی ہے۔

سرچشمۂ فیوض و امن

وہی اَلْكَعْبَةُ' اَلْبَيْتُ الْحَرَامُ' جس کا تذکرہ کرتے ہوئے جب اسی قرآن میں' قیام و بقا سے بھی آگے بڑھ کر'

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا (البقرہ ۲ : ۱۲۵)

اور جب بنایا ہم نے اسی اَلْبَيْتَ (گھر) کو انسانوں کے لیے مَثَابَة اور اَمْن (کا ذریعہ)

کی بھی تصریح کر دی گئی ہے۔ مَثَابَة کی لغوی و اصطلاحی تشریح کرتے ہوئے علامہ راغب اصفہانیؒ اپنے مفردات میں لکھتے ہیں "پینے والوں کے لیے کنویں کے منہ پر جو جگہ ہوتی ہے اسی کو مَثَابَہ کہتے ہیں۔" اب سوچیے کہ مَثَابَہ ہونے کی یہی حیثیت جب اَلْكَعْبَة کو حاصل ہے' تو اس کا حاصل اس کے سوا اور کیا ہوا کہ سارے فیوض و برکات جو زمین کے اس کُرّے پر تقسیم ہو رہے ہیں' ان کے گزرنے کا مرکزیؔ نقطہ یہی اَلْكَعْبَة ہے۔

اور صرف مَثَابَةً ہی نہیں' بلکہ اسی آیت کے لفظ امنا سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ امن و

امان سارا قدرت نے اسی "اَلْبَیْتُ الْحَرَام" کے ساتھ وابستہ فرما دیا ہے۔

الغرض یہاں جس کسی کو جہاں کہیں جو کچھ بھی مل رہا ہے اسی اَلْکَعْبَۃ کی راہ سے مل رہا ہے۔ یہ قرآن کے نصوصِ صریحہ کا اقتضا ہے۔ گویا یوں سمجھنا چاہیے کہ ساری کائنات کے ساتھ العرش کی جو نسبت قرآن نے بیان کی ہے' کہ اَلرَّحْمٰن اسی اَلْعَرْش کو مرکز بنا کر اپنی رحمتیں دنیا میں تقسیم فرما رہا ہے' یہی نسبت زمین کے خاص کُرّے کے ساتھ اَلْکَعْبَۃ بھی رکھتا ہے۔ حضرت آدمؑ کو خطاب کرکے رَبُّ العزت نے جو فرمایا اس سے --- کہ "اے آدم' اتارا ہے میں نے تیرے لیے ایک گھر' تو اس گھر کا اسی طرح طواف کرے گا جیسے "اَلْعَرْش" کے گرد طواف کیا جاتا ہے' اور تو اس گھر کے آگے اسی طرح نماز پڑھے گا جیسے میرے عرش کے سامنے نماز پڑھی جاتی ہے۔" (تاریخ الخمیس ج ۱' ص ۸۹) --- اور دوسری روایتوں سے بھی' اسی کی تصدیق ہوتی ہے کہ کرۂ ارض کا "قلب" اور وہ مرکزی نقطہ جس سے سارے برکات و فیوض اس زمین پر بنٹ رہے ہیں' یہی اَلْکَعْبَۃ ہے۔

مشہور قرآنی آیت --- اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ ○ (آل عمران) سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے لیے بنایا گیا وہ قطعاً" وہی ہے جو "مکہ" میں ہے' جو سارے جہانوں کے لیے مبارک بھی ہے اور ان کی ہدایت کا سرچشمہ بھی --- کے بعد تو اس قسم کی روایتوں سے تائید حاصل کرنے کی بھی قطعاً ضرورت باقی نہیں رہتی۔ آخر روایتوں سے یہی تو معلوم ہوتا ہے کہ زمین کے کرّے پر جو سب سے پہلا نقطہ متعین کیا گیا' یہ وہی حصہ ہے جسے اَلْکَعْبَۃ کی دیواریں اس وقت تک گھیرے ہوئے ہیں۔ روایتوں پر تو یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ اس واقعہ کا مشاہدہ کرنے والا اس وقت کون موجود تھا؟ لیکن جو قرآن کی خبروں پر یقین کرتے ہیں کہ خالقِ کائنات کی دی ہوئی خبریں ہیں' ان کے لیے تو اس شبہ کی گنجائش بھی باقی نہیں رہتی۔ کیونکہ یہ تاریخی شہادت تو اسی کی ہے جو اس وقت بھی موجود تھا جب نہ زمین پھیلائی گئی تھی اور نہ آسمانوں کے خیمے تانے گئے تھے' اور اس وقت بھی وہ غائب نہ تھا جب اَلنَّاس یعنی نسل انسانی کے لیے یہ سب سے پہلا گھر بنایا جارہا تھا۔ بلکہ اس واقعہ کی خبر دینے والا ہی وہ ہے جس نے حد بندی کے اس عمل سے زمین کے اس خاص حِصّہ کو امتیاز بخشا ہے۔ اس سے بڑھ کر یقینی خبر اور کس کی ہو سکتی ہے۔

یہی نہیں' بلکہ آگے "مُبٰرَکًا" کے لفظ کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ برکتوں کا خزینہ اور فیوض کا حقیقی دفینہ بھی زمین کے اسی حصّہ کو بنایا گیا۔ یہی وہ قدرتی سرچشمہ ہے جس

سے برکتیں اُبل رہی ہیں' اور وہیں سے چھلک چھلک کر ساری دنیا میں تقسیم ہو رہی ہیں۔

یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ العالمین' یعنی سارے جہانوں کے لیے رہنمائی اور ہدایت کا توحیدی نظام جب قائم کیا گیا' اور نبوت کو ختم کر کے العالمین کی ہدایت کا مرکزی مقام مکہ منتخب ہوا' جیسا کہ ھُدًی لِّلْعَالَمِیْنَ کے الفاظ کا اِقتضا ہے تو یہ اتفاقی واقعہ نہ تھا' بلکہ جو مقام مادی برکتوں کا سرچشمہ تھا' اسی کو دینی و اخلاقی تعلیمات کی اشاعت کا مرکز بھی مقرر کیا گیا۔ آخر لِلْعَالَمِیْنَ کے لفظ کا تعلق صرف ھُدًی ہی کے لفظ سے کیوں سمجھا جائے' میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ "مُبَارَکًا" کے لفظ کو بھی لِلْعَالَمِیْنَ سے مربوط سمجھنا چاہیے۔

مجھے تو حیرت ہوتی ہے کہ ان صریح نصوص اور واضح بیّنات کی روشنی میں بھی اُمّ القُرٰی' جو مکہ کا قرآنی نام ہے' اس کے سمجھنے یا سمجھانے سے لوگ کیوں گریز کرتے ہیں۔ اَلْقُرٰی کا لفظ یقیناً ایک عام اور مطلق لفظ ہے' ان ساری آبادیوں کو حاوی ہے جو زمین کے کسی گوشہ میں "شرقاً" و "غرباً" "شمالاً و جنوباً" پہلے پائی گئی ہوں' یا اب پائی جاتی ہوں' یا آئندہ پائی جانے والی ہوں' وہ ایشیا میں ہوں یا افریقہ میں' امریکہ میں ہوں' یا یورپ میں۔ قرآنی الفاظ کے مستند شارح علامہ راغبؒ نے بھی اُمّ القُرٰی کی یہی تشریح کرتے ہوئے حضرت علیؓ سے نقل کیا ہے کہ "ساری دنیا اسی کے نیچے سے پھیلائی گئی۔" اشارہ اسی برکاتی مرکزیت کی طرف ہے جسے قرآن میں "مُبَارَکًا" کے لفظ سے ادا کیا گیا ہے۔

سب سے پہلا گھر

بکہ کے' اسی آبادی کے دوسرے نام یا تلفظ یعنی بکہ کے لفظ کو قرآن نے یہاں جو اختیار کیا ہے' یہ بھی میرے خیال میں کوئی اتفاقی بات نہیں ہے۔ نزولِ قرآن سے صدیوں پہلے اَلْکَعْبَۃ کی اسی عالمگیر اہمیت کا انکشاف کرتے ہوئے' پیغمبر داؤدؑ کتاب زبور میں یہ والہانہ تمہیدی فقرات ارشاد فرماتے ہیں:

> اے لشکروں کے خداوند' تیرے مسکن کیا ہی دلکش ہیں! میری رُوح خداوند کی بارگاہ کے لیے آرزو مند بلکہ گداز ہوتی ہے۔ میرا مَن' میرا تَن' زندہ خدا کے لیے للکارتا ہے۔

پھر اس کی مثال دیتے ہوئے کہ ہر چیز ایک مرکز رکھتی ہے' فرماتے ہیں:

> گوریے نے بھی اپنا گھونسلا' اور ابابیل نے بھی اپنا آشیانہ پایا ہے' جہاں وہ اپنے بچے رکھیں۔

آخر میں زبور کا یہ مشہور فقرہ ہے ؛ کہ :

مبارک وہ انسان ہیں، جن میں قوت تجھ سے ہے ، اور ان کے دل میں تیری راہیں ہیں۔ وہ بکّہ کی وادی میں گزر کرتے ہیں ، اور اسے ایک کنواں بناتے ہیں ، پہلی برسات اسے برکتوں سے ڈھانپ لیتی ہے۔

یہ داؤدؑ کی کتاب "زبور" کے مزمور ۸۱ کے فقرے ہیں۔ اس میں چاہِ زمزم ہی کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا ہے ، بلکہ قرآنی لفظ "مبارک" کے مفہوم کو بھی خاص پیرایہ میں ادا کر دیا گیا ہے۔ پہلی برسات ، الرحمٰن کی پہلی توجہ ہے جو کرۂ زمین کی آبادی کے لیے کی گئی۔

آج کل زبور کے جو تراجم شائع ہو رہے ہیں ان میں بکّہ کے لفظ کو اپنی اصلی صورت پر باقی نہیں رکھا گیا ہے۔ ... لیکن آپ مشہور عیسائی عالم پروفیسر مارگولیوتھ ، کی جو نسلاً یہودی تھا ، یہ شہادت پڑھ سکتے ہیں کہ بجز مکّہ معظمہ کے زبور کا یہ بکّہ اور کوئی دوسرا مقام نہیں ہو سکتا۔ میرا خیال ہے کہ بجائے عام اور مشہور نام "مکّہ" کے ، یہ بتاتے ہوئے کہ یہی سب سے پہلا گھر ہے ، بکّہ کے نام اور تلفّظ کو جو اختیار کیا گیا ہے تو یہ اشارہ غالباً اسی مزمور (۸۱) کی طرف ہے جس میں داؤدؑ نے بکّہ ہی کے لفظ سے اس کو یاد کیا ہے۔ یہ اَلْکَعْبَۃ کی قدامت کے لیے یقیناً ایک اہم تاریخی وثیقہ ہے ، موجودہ زمانہ کے حساب سے تین ہزار سال سے کم پرانی شہادت یہ نہیں ہے۔

لیکن داؤدؑ کا زمانہ تو نسبتاً بعد کا زمانہ ہے ، ان سے پہلے انبیا علیہم السلام کی طرف منسوب نوشتے جو بائبل کے موجودہ مجموعہ میں پائے جاتے ہیں ، ان میں اَلْکَعْبَۃ کے متعلق آپ کو مسلسل تاریخی شہادتیں ملتی چلی جائیں گی۔ تورات کا فقرہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ہے : "اس نے بیت ایل کے جنوب کے ایک پہاڑ کے پاس اپنا ڈیرہ قائم کیا۔ یم (یعنی سمندر) اس کے مغرب میں ، اور عی اس کے جنوب میں تھا" (تکوین باب ۱۲)۔ تورات کے عالم جانتے ہیں کہ یہ بیت ایل ، یعنی بَیْتُ اللہ جس کے جنوب میں ابراہیمؑ نے اپنا ڈیرا گاڑا تھا ، یہ وہی اَلْکَعْبَۃ (بیت اللہ الحرام) کا مرکزی نقطہ تھا جہاں بعد کو حضرت ابراہیمؑ نے اپنے صاحبزادے حضرت اسماعیلؑ کے ساتھ گھر اٹھایا تھا۔ یم یعنی سمندر کا اَلْکَعْبَۃ کے مغربی سمت میں ہونا تو ایک عام کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ رہا "عی" ، قدیم جغرافیہ عرب کا مطالعہ اس کے لیے کرنا چاہیے۔ ...

بہرحال اگرچہ بنی اسرائیل کے پیغمبروں کے یہ نوشتے صدیوں سے بگاڑنے اور چھپانے ، مشتبہ کرنے کی مسلسل کوششوں کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں ، لیکن بچی کھچی جو چیزیں اس وقت تک ان کتابوں میں پائی جاتی ہیں ، جن میں کرۂ زمین کے اس مرکزی "مقام مبارک" کا تذکرہ کیا گیا ہے ،

اگر سب کو جمع کیا جائے تو وہ کافی ضخیم رسالہ بن سکتا ہے۔ ایسا رسالہ جسے دیکھ کر اضطراراً آدمی اس قرآنی دعویٰ کی یعنی --- (اہلِ کتاب) جانتے ہیں اس اَلْکَعْبَہ کو اسی طرح جیسے پہچانتے ہیں وہ اپنے بچوں کو --- تصدیق و اعتراف پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کاش کسی کو توفیق ہوتی کہ اس قرآنی اشارے کی توضیح کے لیے بائبل کی ان گواہیوں کو جمع کردیتا۔ کیا عہدِ اسلامی سے پہلے بنی اسرائیل کے ان نوشتوں کے متعلق بھی اس شبہ کی گنجائش ہے کہ مسلمانوں نے اپنی طرف سے ان الفاظ کا اسرائیلی کتابوں میں اضافہ کردیا ہے۔

اور یہ کتابیں تو خیر مذہب و دین سے تعلق رکھتی ہیں، مگر مسلمانوں سے پہلے بہت پہلے یونان و روم کے مورّخوں کی کتابوں میں سرزمینِ عرب کے اس پرانے مَعْبَد اَلْکَعْبَہ کا ذکر جن الفاظ میں پایا جاتا ہے، ان کو دیکھنے کے بعد یہ دعویٰ کیا غیر تاریخی یا بے بنیاد ٹھہرایا جاسکتا ہے کہ پشتِ زمین پر آج جتنے مکانات پائے جاتے ہیں ان میں کوئی مکان یا گھر قرآن کے اس "اَوّلُ البَیْت" کے مقابلہ میں اس حیثیت سے اپنے آپ کو نہیں پیش کرسکتا کہ مسلسل نہ صرف اپنے وجود کو بلکہ، احترام و عزت کی مرکزیت کو، باقی رکھتے ہوئے موجودہ عہد تک چلا آیا ہو۔

ہیروڈوٹس جو حضرت مسیحؑ سے چھ سو سال پہلے گزرا ہے، اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ عرب کے اس مَعْبَد کا بہت قدیم زمانے سے لوگ احترام کرتے چلے آئے ہیں۔ ہیروڈوٹس کی شہادت ہی تقریباً اڑھائی ہزار سال کی ہے۔ خیال کرنا چاہیے کہ اڑھائی ہزار سال پہلے بھی جس گھر اور مکان کے متعلق یہ خبر دی جاتی ہو کہ بہت قدیم زمانے سے لوگ اس کا احترام کرتے چلے آئے ہیں تو اس کی قدامت کی تاریخ کتنی طویل ہو جاتی ہے۔ خصوصاً جب اس کو بھی پیشِ نظر رکھ لیا جائے کہ دنیا کے عام شہروں اور آبادیوں کے متعلق جن معلومات کو صحیح تاریخی معلومات قرار دیا جاسکتا ہے، ان کی مدت اڑھائی تین ہزار سال سے آگے نہیں بڑھتی، کار تھیج ہو یا ایتھنز، ہامھانی ہو یا روم، سب ہی کا حال یہی ہے۔

اب سمجھ میں آتا ہے کہ قرآن نے اسی اَلْکَعْبَہ کا ذکر کرتے ہوئے، منجملہ دوسرے صفات کے، بعض مقامات میں اس کو "اَلْبَیْت اَلْعَتِیْق" کے نام سے جو موسوم کیا ہے، یہ صفت صرف اضافی ہی نہیں ہے۔ تاریخی تحقیقات کے سلسلے کو لوگ اگر جاری رکھیں تو ان پر واضح ہوتا چلا جائے گا کہ اس مکان کی "حقیقی صفت" یہی ہے۔ یعنی ثابت ہوگا کہ دنیا کے تمام پرانے گھروں میں جو کبھی پائے گئے یا اب بھی کہیں پائے جاتے ہیں، سب کے مقابلے میں یہی مکان کرۂ زمین کا قدیم ترین گھر ہے۔

وسطِ زمین

اور سچ تو یہ ہے کہ بائبل کا بیت ایل' اور قرآن کا بیت اللہؑ' جس آبادی میں پایا جاتا ہے اس کے' اور جس ملک سے اس آبادی کا تعلق ہے اس کے' متعلق تاریخی شہادتوں کے علاوہ ان کے جغرافیائی پوزیشن پر بھی اگر توجہ کی جائے' تو اس قرآنی اشارے کا مطلب سمجھ میں آ سکتا ہے جسے سورۃ البقرہ میں ہم پاتے ہیں۔ امّتِ اسلامیہ محمدیہؐ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے' کہ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا' اور اسی طرح بنایا ہم نے تم لوگوں کو وسط اور بیچ والی امت۔ اس سے پیشتر جیسا کہ ہر قرآن پڑھنے والا جانتا ہے اَلْكَعْبَة ہی کا ذکر ہے اور فرمایا گیا ہے کہ ... بجائے مشرقی خطوں اور مغربی اقلیموں کے' مسلمانوں کو زمین کے اس حصہ میں قبلہ عطا کیا گیا ہے جو نہ مشرق سے زیادہ دُور ہے اور نہ مغرب سے' اور یہ خدا کا فضل اور اس کی حکمت کا اقتضا ہے۔

بہرحال اس آیت کی صحیح تفسیر کا یہاں موقع نہیں ہے۔ جب مسلمانوں کو وسط اور بیچ میں واقع ہونے والی درمیانی اُمّت قرار دیتے ہوئے ان کے اس حال کو قبلہ سے تشبیہ دی گئی ہے' تو صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ قرآن مطلع کرتا ہے کہ جغرافیائی حیثیت سے ان کا قبلہ بھی وسط اور ایسے علاقہ میں واقع ہے جو دنیا کے معمور اور آباد علاقوں کے درمیانی حصہ ہونے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے معنی یہی ہوئے کہ روایتوں میں اَلْكَعْبَة یا مَكَّہ کو جو سرۃ الارض (نافِ زمین) کے لفظ سے موسوم کیا گیا ہے' یہ دراصل اسی قرآنی خبر کی تعبیر اور توضیح ہے۔

آج ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ مشرق و مغرب کے سارے مواصلاتی ذرائع' خواہ ان کا تعلق خشکی سے ہو یا تَری سے یا فضا اور ہَوا سے' تقریباً عام حالات میں ہر ایک کو اسی علاقے سے گزرنا پڑتا ہے جس میں اَلْكَعْبَة واقع ہے۔ اسی طرح شمال میں ۸۰ درجہ تک' اسی طرح اس کے بالمقابل جنوب میں ۴۰ درجے تک' عموماً انسانی آبادیاں پائی جاتی ہیں۔ مجموعی طور پر ۱۲۰ درجے تک دنیا کی آبادی شمالاً و جنوباً پھیلی ہوئی ہے' اس لیے دنیا کے درمیانی علاقے وہی ہو سکتے ہیں جو ۲۰ اور ۲۱ درجے پر واقع ہیں' اب اطلس اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ وہی آپ کو جواب دے گا کہ عرب کا ملک جس میں اَلْكَعْبَة واقع ہے اس کا محلِ وقوع اس سلسلے میں کہاں ہے۔ ...

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن نے' یہ بتایا ہے کہ "العالمین" کی ہدایت و ارشاد کا نظام اسی مقام میں قائم ہوگا' جو اس سے پہلے' اسی عالمگیر تبلیغی نظام کی تمہید میں' ابراہیمؑ کا مقام بنا۔ اسی کے ساتھ اس نے یہ بھی بتایا کہ فِيهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ' یعنی اس گھر میں اور بھی کھلی کھلی نشانیاں ہیں۔ ان آیات بیّنات اور کھُلی کھلی نشانیوں کو آپ تلاش کرتے چلے جایئے۔ راز کے بعد راز کا مسلسل انکشاف

آپ پر ہوتا چلا جائے گا۔ تاریخ کے اوراق بھی اس باب میں آپ کی مدد کریں گے' جغرافیہ کے اطلسوں سے بھی آپ اس سلسلے میں اعانت حاصل کرسکتے ہیں' اقوام و اُمم کے آسمانی رہنماؤں کے کلام میں بھی اس اَلْبَیْتُ الْعَتِیْق کے متعلق اَتے پَتے ملتے چلے جائیں گے۔

یہ ساری نشانیاں آپ پر واضح کریں گی کہ اس گھر کے ساتھ مسلمانوں کا تعلق نری خوش اعتقادی پر مبنی نہیں ہے' بلکہ قدرت کے مقررہ طبعی قوانین کا یہ منطقی نتیجہ ہے۔ مسلمان اگر سمجھتے ہیں کہ نسلِ انسانی کا پہلا ابتدائی قبلہ بھی اَلْکَعْبَہ ہی تھا' پھر جب مختلف علاقوں کے بکھرے ہوئے انسانوں کو باہم ایک دوسرے سے قریب تر ہو جانے کی صورت نکل آئی تو مختلف مقامی قبلوں سے ہٹا کر سب کو اسی پُرانے واحد مرکزی قبلہ پر جمع کردیا گیا' تو یہ ایک ایسی بات ہے جس کی تائید ان ہی "آیات بیّنات" سے ہورہی ہیں جن کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے۔ . . .

حضرت ابنِ عباسؓ کی طرف یہ بات منسوب کی گئی ہے کہ "ہندوستان سے اَلْکَعْبَہ کا حج حضرت آدمؑ نے چالیس دفعہ فرمایا۔" میں مانتا ہوں کہ سنداً اس قسم کی روایتوں کا ذخیرہ بہت کچھ محلِ اِشتباہ ہے' لیکن جب قرآن کے نصِّ قطعی سے معلوم ہوتا ہے کہ النّاس یعنی آدمیوں کے لیے سب سے پہلا گھر بکّہ ہی میں بنایا گیا' تو ان روایتوں کا جو حاصل ہے' یعنی حضرت آدم علیہ السلام وادی بکّہ کے اس اوّل البَیت سے تعلق رکھتے تھے' آخر اس کو مشتبہ قرار دینے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ زمین کے اس خاص حصّہ کی تحدید و تعین کے لیے ابتدا میں کیا صورت اختیار کی گئی تھی' یہ ایسی کوئی بات نہیں ہے جس کی تحقیق میں سر کھپایا جائے۔ پتھر لگائے گئے تھے یا صرف مٹی کی دیواریں اٹھائی گئی تھیں' پھر پتھر اگر استعمال کیے گئے تھے تو کس قسم کے پتھر سے اس کی تعمیر ہوئی تھی' قرآن میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا ہے۔ اور یہی اس کا عمومی دستور ہے کہ غیرضروری امور سے اعراض کرکے مسلمانوں کو بھی گویا سکھاتا ہے کہ ان لایعنی مشاغل سے' جہاں تک ممکن ہو' اپنے آپ کو محفوظ رکھیں۔ . . .

تجلّی گاہِ ربّانی

آپ دیکھ رہے ہیں کہ اَلْکَعْبَہ کی مرکزیت کے اظہار کے لیے ان تمام حقائق سے قرآن نے پردہ اٹھا دیا ہے جن کے متعلق ممکن ہے کہ غیر ایمانی' عامیانہ فطرتوں میں ہچکچاہٹ پیدا ہو۔ اس نے صاف صاف لفظوں میں اعلان کیا ہے کہ النّاس کے قیام و بقا کا تعلق بھی اسی اَلْکَعْبَہ سے ہے' وہی النّاس کے لیے مَثَابہ (پن گھٹ) ہے' اور ان کا امن و امان بھی اسی کے ساتھ وابستہ ہے'

اَلْعَالَمِیْن یعنی سارے جہانوں کے لیے وہ مبارک بھی ہے' اور ان میں ہدایت کی عمومی روشنی کی تقسیم کا مرکز بھی یہی گھر بنے گا۔۔۔

اور جیسے سارے عالَم میں اپنی رحمتوں کو تقسیم کرنے کے لیے اَلْعَرْشُ الْعَظِیْمُ پر الرحمٰن مستوِی ہوا' اسی طرح کرۂ ارض کی رحمتوں کی تقسیم کے لیے اَلْکَعْبَۃ کو اس نے اپنی تجلی کی فرودگاہ خاص ٹھہرایا۔ اور' بقول مولانا محمد قاسم نانوتویؒ ' اگرچہ آفتاب آئینے میں نہیں اترتا' لیکن جو خاص قسم کی تجلی آفتاب کی آئینے میں ہوتی ہے اسی کا نتیجہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ ہو بہو کامل آفتاب آئینے میں جھلکتا اور چمکتا نظر آرہا ہے۔ کچھ اسی طرح سمجھنا چاہیے کہ جو آسمان و زمین میں بھی نہیں سما سکتا' وہی خالقِ ارض و سماوات' اَلْکَعْبَۃ کی "تجلی گاہِ خاص" میں نمایاں ہے۔ جیسے آئینے کو بیت الشمس کہہ سکتے ہیں' اسی طرح اَلْکَعْبَۃ پر بھی "بیت اللہ" کا اطلاق ایک صحیح مشاہداتی یافت ہی کا یہ اعتراف ہوگا۔

ذات حق کی یہی تجلّی کامل درحقیقت بنیاد ہے ان سارے دینی اور روحانی تعلقات کی جن کو اَلْکَعْبَۃ کے ساتھ اسلام قائم کرنا چاہتا ہے۔

(تلخیص و تدوین: خ - م)

دِل بدست آور کہ حجِ اکبر است

ایک شخص حضرت بشرؒ کے پاس آیا اور کہا: میرا ارادہ حج کا ہے۔ کچھ نصیحت فرمائیے۔

آپ نے پوچھا: حج کے واسطے تمہارے پاس کیا ہے؟

اُس نے کہا: دو ہزار درہم۔

فرمایا: اگر یہ دو ہزار درہم خرچ کر کے تمہیں گھر بیٹھے رضائے الٰہی مل جائے اور یہ یقین بھی ہو کہ بیشک خدا راضی ہوا، تو تم کرو گے؟

اُس نے کہا یقیناً۔

فرمایا: تو جاؤ، اور ان درہموں کو دس آدمیوں کو دے دو: قرض دار کو دو کہ وہ اپنا قرض ادا کر دے، محتاج کو دو کہ وہ اپنی حالت درست کرلے، عیال دار کو دو کہ وہ اپنے عیال کی پرورش کرے، اور اگر تمہارا دل مطمئن ہو تو ساری رقم ایک ہی شخص کو دے دو۔ یہ میں نے اس لیے کہا ہے کہ کسی مسلمان کے دل کو خوش کرنا، مظلوم کی فریاد کو پہنچنا، ضرر کو ٹالنا، اور کمزور کی مدد کرنا، فرض حج کے بعد.. نفل حجوں سے افضل ہے۔ اب جاؤ، جو میں نے کہا ہے وہ کرو، یا جو دل میں ہو وہ بتا دو۔

اُس نے کہا: میرا دل تو سفر ہی پر جما ہوا ہے۔

حضرت بشرؒ مسکرائے اور کہا: جب مال مشتبہ ذرائع سے حاصل ہوتا ہے، تو نفس یہی چاہتا ہے کہ اپنی خواہش پوری کرے۔

بیت اللہ پر پہلی نظر

مرتب: ظفر حجازی

سطح ارض پر "بیت اللہ" پہلی مبارک عبادت گاہ ہے جو انسانوں کے لیے قائم کی گئی اور جسے تمام جہان والوں کے لیے مرکز ہدایت بنایا گیا۔ حضرت آدمؑ سے لے کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک متعدد انبیا نے ضرورت پڑنے پر اس کی تعمیر میں حصّہ لیا۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی تعمیرِ کعبہ کا ذکر بھی قرآن مجید میں موجود ہے: ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ جب اس گھر کی دیواریں اٹھا رہے تھے تو دعا کرتے جاتے تھے: "اے ہمارے رب ہم سے یہ خدمت قبول کرلے۔" (البقرہ ۲: ۱۲۷)۔ حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ "لوگوں کو حج کے لیے اِذنِ عام دے دو کہ وہ تمہارے پاس ہر دُور دراز مقام سے پیدل اور اونٹوں پر سوار آئیں (الحج ۲۲: ۲۷) بیت اللہ کے متعدد نام ہیں: کعبہ، بیت الحرام، بکّہ، اَلْبَیْتُ الْعَتِیْق

بیت اللہ آج بھی اسی صورت میں قائم ہے جو حضور اکرمؐ کے زمانہ میں تھی۔ آپؐ نماز فرض ہونے سے قبل بھی کعبہ رُخ ہو کر عبادت کرتے تھے۔ ہجرت کے بعد تقریباً ڈیڑھ سال تک آپؐ نے بیت المقدس کو قبلہ بنایا لیکن آپؐ کی آرزو تھی کہ مسلمانوں کے لیے کعبہ ہی قبلہ بنے۔ قرآن مجید میں آپؐ کی اس خواہش کا ذکر موجود ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کا رُخ اسی قبلہ کی طرف پھیر دیا جو آپؐ کو پسند تھا (البقرہ ۲: ۱۴۴)۔ آپؐ نے ۷ ہجری کو عمرہ ادا کیا اور ۸ ہجری کو مکّہ فتح کرلیا اور بیت اللہ کو بتوں سے پاک کردیا گیا، ۹ ہجری میں حج کے موقع پر مشرکین کو بیت اللہ میں داخلے سے منع کردیا گیا۔ ۱۰ ہجری میں حضور اکرمؐ نے ایسی شان سے حج کی قیادت کی کہ کوئی مشرک بیت اللہ کی حدود میں موجود نہ تھا۔

کتنی متبرک و مقدس ہے یہ جگہ کہ اللہ کے جلیل القدر انبیا نے اس کا طواف کیا اور کتنے مبارک تھے وہ لمحات کہ خاتم النبین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے گھر کا طواف کیا اور حجرِ اسود کو بوسہ دیا، ہزاروں صحابہؓ انؐ کے جلو میں تھے، وہ صحابہؓ کہ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے، کتنے ہی صدیقین، شہداء، صالحین اور اللہ کے ایسے برگزیدہ بندے

جن پر اللہ کا انعام ہوا' اس مقدس سرزمین پر اللہ کے گھر کا طواف کرتے اور حجرِ اسود کو بوسہ دیتے آرہے ہیں۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ دل' شوق و محبت کے جذبات سے معمور اور آنکھیں بیت اللہ کی زیارت کے لیے بے تاب' عشاق کے قافلے دور دراز مقامات سے آج بھی بیت الحرام میں پہنچ رہے ہیں۔ بیت اللہ پر پہلی نظر پڑتے ہی دل و دماغ کی کیفیات کو بعض زائرین نے قلم بند کیا ہے۔ یہاں چند ایک حج ناموں میں سے صرف وہ اقتباس دیے جا رہے ہیں جو ان احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں جو خانہ کعبہ پر پہلی نظر پڑتے ہی مصنفین پر طاری ہوئے . . . اقتباسات زمانی ترتیب سے دیے گئے ہیں اور اقتباس کے آخر پر ماخذ اور حج کا سال دیا گیا ہے۔

مولانا رفیع الدین مراد آبادی

سعدیہ سے چل کر' دو دن بعد' بوقت چاشت ۱۴ شوال بروز دو شنبہ مکّہ معظمہ میں حاضر ہوئے۔ چونکہ چار کوس سے زیادہ پیادہ پا اور سروپا برہنہ چلا تھا' اور آفتاب بہت گرم تھا' سنگریزے اور ریگِ راہ جل رہے تھے' اس لیے بہت مشقت برداشت کرنی پڑی۔ لیکن دیدارِ جمالِ کعبہ سے تمام عمر کی کلفتوں کا ازالہ ہوگیا۔

اس مَورِدِ مسعود میں آنے کے وقت مشتاقانِ جمالِ مصطفویؐ کو مواضع اقدام نبویؐ کے مشاہدے سے' اور آنحضرتؐ کے اس مقام پر رونق افروز ہونے کے تصوّر سے' دل میں وہ نوُر اور باطن میں وہ سرور پیدا ہوتا ہے کہ بیان سے باہر ہے۔

طالبِ صادق پر' کہ جس کی چشم بصیرت کحلِ ہدایت سے سرگیں ہو اور اس کا دیدۂ باطن نورِ عنایت سے منوّر ہو' یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ تمام حرمین اور اس کے نواح کے پہاڑوں' جنگلوں' وادیوں اور مکانوں میں' جو کہ منظورِ نظر سعادت اثر رہے ہیں' اور ناظرِ جمال' بہجت مآل ہوئے ہیں' جمالِ محمدیؐ کے اثر سے کس قدر نورانیت و روحانیت نمایاں ہے۔

بہر زمیں کہ نسیمے ز زلف آوردہ است   ہنوز از دمِ آں بوئے عشق می آمد

ایک دن بعد نماز عشا متصل مصلائے مالکی مَطاف میں بیٹھا ہوا تھا۔ چاندنی رات تھی اور مکّہ معظمہ کا جاہ و جلال عجیب شان دکھا رہا تھا۔ اتنے میں علی نام کے ایک درویش جو بغداد کے رہنے والے ہیں' مردِ صالح اور عالم ہیں' میرے پاس آئے۔ بعد مکالمہ وحصولِ تعارف' میں نے ان سے کہا' تم مردِ صالح ہو' میرے لیے دعا کرو کہ حق تعالیٰ میری مغفرت کرے اور میرا یہ سفر قبول فرمائے۔ انھوں نے کہا' کیا تم ایسے شخص کو جس سے تم ناراض ہو' اپنے گھر آنے دیتے ہو؟ میں نے کہا' نہیں۔ وہ بولے' بس اِسی طرح اللہ تعالیٰ انھی لوگوں کو اپنے گھر بلاتا ہے جن سے

راضی ہوتا ہے، بیگانوں کو اپنے گھر میں داخل نہیں ہونے دیتا۔ پھر کہا، کہ حق تعالیٰ اپنے علمِ قدیم کی رُو سے ہمارے ایک ایک عیب کو جانتا ہے اور جب کوئی کسی غلام کو، اس کے عیب سے مطلع ہونے کے باوجود، خریدتا ہے، تو اس عیب کی وجہ سے اس پر عتاب نہیں کرتا۔ ہم بھی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے امیدوار ہیں کہ ہمارے ان عیبوں کو، جن سے وہ ہمارے پیدا ہونے سے پہلے واقف ہے، پوشیدہ رکھے گا اور ان کی بنا پر ہم سے مواخذہ نہ کرے گا۔ اس درویش کے کلام سے اس وقت دل کو ایک عجیب راحت پہنچی۔ اللہ تعالیٰ اس پر رحمت کرے۔

(**سوانح الحرمین** (فارسی)، اردو ترجمہ "**سفرنامہ حجاز**": نسیم احمد فریدی امروہوی، ۱۲۰۱ھ: ۱۷۸۷ء)

نوآب محمد مصطفیٰ خان شیفتہ

۱۷ ذیقعد کو بطحا کی مقدّس وادی میں پہنچ گئے۔ الحمد للہ ثم الحمد للہ۔ کعبۃ اللہ کے جلوے نے تمام غم دُور کردیے۔ ہونٹوں کو حجرِ اسود چومنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ پیشانی عتبہ عالیہ پر گھسنے سے منوّر ہوئی۔ ہاتھوں کو اِستلام رکن کا شرف حاصل ہوا۔ آبِ زمزم نے شرابِ طہور کی بشارت دی۔ طوافِ بیت اللہ نے آتشِ دوزخ سے نجات کی نوید دی۔ کعبہ شریف کے پردے دونوں ہاتھوں سے تھام کر گویا دامنِ امید تھام لیا۔ صفا و مروہ کی سعی کی برکت سے پاؤں، کوہِ آتشیں پر چڑھنے اترنے سے محفوظ ہوگئے۔

(**ترغیب السالک اِلی اَحسن المسالک** (فارسی) اردو ترجمہ "**ماہِ منیر**" ۱۲۵۵ھ: فروری ۱۸۴۰ء)

غلام رسول مہر

میری آلودۂ معصیت نگاہیں اس مقدّس گھر پر پڑیں جو اس کائنات کا **افضل** ترین مقام ہے اور جو دن میں پانچ مرتبہ کروڑوں پیشانیوں کا نقطۂ ماسکہ بنتا ہے۔ ہم باب السلام سے داخل ہو کر بیت اللہ کی طرف بڑھے تو زبان پر یہ دعا جاری تھی: "**اَللّٰهُمَّ زِدْ هٰذَا الْبَيْتَ تَشْرِيْفًا وَّ تَعْظِيْمًا وَّ تَكْرِيْمًا وَّ مَهَابَةً وَّ زِدْ مَنْ زَارَهُ هٰذَا الْبَيْتَ تَشْرِيْفًا وَّ تَعْظِيْمًا وَّ تَكْرِيْمًا وَّ مَهَابَةً**" ---

اللہ اکبر، کتنا پاک مقام ہے، کتنی مقدس دعائیں مانگی گئی ہیں کتنا مزکّی خطّہ ہے! ساڑھے تیرہ سو سال کی مدّت میں اس مقام پر اللہ تعالیٰ کو جس درجہ یاد کیا گیا ہے اور اس کی بارگاہ میں عاجزی کے ساتھ جس قدر دعائیں مانگی گئی ہیں، دنیا کی کسی عبادت گاہ میں نہیں مانگی گئیں۔ بلکہ میرا دعویٰ تو یہ ہے کہ ساری دنیا کی عبادت گاہوں کے ذکروں اور دعاؤں کو ملا کر بھی بیت اللہ کے ذکر و دُعا

کے مقابلے میں پیش نہیں کیا جاسکتا۔ عرب کے موسمِ گرما کی تن سوز دوپہر ہو یا دنیا و مافیہا کے سکون و آرام کی تیرہ و تار راتیں ہوں' بیت اللہ کا دامن ذاکروں کی نداؤں سے اور مُطاف طائفین کے ذِکر و دُعا سے کبھی خالی نہیں ہوا۔ یہ شرف اور کس مقام کو حاصل ہے ! محی الدین ابن عربی کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ دس سال حرمِ پاک میں اس انتظار میں رہے کہ انھیں تنہا طواف کا موقع مل جائے۔ دس سال میں صرف ایک مرتبہ ایسا موقع ملا' اور جس حد تک طواف کا تعلق ہے' ظاہر ہے کہ حرمِ پاک کو شیخ محی الدین کے طوافِ تنہائی میں بھی خالی نہیں کہا جاسکتا۔ یہ ہے حرمِ پاک کی عظمت' یہ ہے حرمِ پاک کا مقامِ تکریم و تعظیم' یہ ہے حرمِ پاک کی برتری !

(سفر نامہ حجاز' مئی ۱۹۳۰ء)

ابوالقلم خاموش فتح پوری

آدھی رات کے قریب مکّہ معظمہ کی روشنی نے آنکھوں کو نور بخشا۔ ساری تکان اور صعوبتیں غائب ہوگئیں۔ وضو کیا اور سیدھے حرم شریف میں داخل ہوئے۔ قدم رکھتے ہی ایک عجیب طرح کا کیف و سرور دل و دماغ پر چھا گیا۔ اپنے آپ کی خبر نہ رہی۔ خدا جانے ان اینٹ پتھروں میں کہاں کی مقناطیسی قوّت ہے کہ انسان بے سوچے سمجھے جھومنے لگتا ہے۔ حرم شریف کی روشنی میں گزرتے ہوئے اس مقام پر پہنچے جہاں میری لیلائے مراد' سیاہ لباس پہنے ہوئے' گلے میں سنہری ہار ڈالے' ہزاروں برس سے میرے انتظار میں کھڑی تھی۔ میں اس کے گرد گھوم کر قربان ہوا۔ معلم صاحب دعا پڑھاتے گئے۔ طواف کی دعائیں کیا ہیں ! اگر انسان سمجھ کر پڑھے تو واقعی جنم جنم کے روگ وہیں ختم ہو جائیں۔ میری آنکھوں سے خود بخود آنسو ابل پڑے۔

(مارچ ۱۹۳۴ء)

ابوالحسن علی ندوی

میں نے بچپن میں جس طرح لوگوں کو جنّت اور اس کی نعمتوں کا بڑے شوق سے ذکر کرتے ہوئے سنا' اسی طرح مکّے اور مدینے کا تذکرہ بھی سنا تھا۔ جنت کو حاصل کرنے اور ان دونوں متبرک شہروں کو دیکھنے کی تمنا اسی وقت سے میرے دل میں کروٹیں لینے لگی تھی۔ پھر ایسا ہوا کہ ایک طویل عرصے کے بعد میں خود اس جگہ آ پہنچا جس کی زمین پر نہ تو سبزے کا فرش تھا اور نہ اس کی گودی میں ندیاں کھیلتی تھیں۔ اس کے چاروں طرف جلے ہوئے پہاڑ کھڑے پہرہ دے رہے تھے۔

جب میں نے حُسنِ ظاہری سے خالی یہ سرزمین دیکھی تو میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہ شہر مناظر سے کتنا تہی دست ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ میں نے یہ بھی سوچا کہ اس شہر نے انسانیت اور تمدن پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔ اگر یہ شہر جس کا دامن گُل کاریوں سے خالی ہے، روئے زمین پر نہ ہوتا تو دنیا ایک سونے کا پنجرہ ہوتی اور انسان محض ایک قیدی!

یہی وہ شہر ہے جس نے انسان کو دنیا کی تنگنائے سے نکال کر وسعتوں سے آشنا کیا۔ انسان کو اس کی کھوئی ہوئی سرداری اور چھنی ہوئی آزادی دلائی۔ اسی شہر نے انسانیت پر لدے ہوئے بھاری بوجھوں کو اتارا۔ اس کے طوق و سَلاسل کو جُدا کیا جو ظالم بادشاہوں اور نادان قانون سازوں نے ڈال رکھے تھے۔ وہ عزت دنیا کو دوبارہ ملی جو سرکشوں اور ظالموں کے ہاتھوں پامال ہو چکی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ یہاں انسانیت نے نیا جنم لیا اور تاریخ نئے سرے سے ڈھل کر نکلی۔

لیکن مجھے ہوا کیا ہے جو میں کہتا ہوں کہ "اگر یہ شہر نہ ہوتا" "اگر مکّہ نہ ہوتا"! اگر مکّہ نہ ہوتا تو کیا ہو جاتا۔ مکّہ تو اپنے خشک پہاڑوں، ریتیلے ٹیلوں، بلکہ خانہ کعبہ اور زمزم کے متبرک کنوئیں کو اپنی گود میں لیے ہوئے چھٹی صدی مسیحی تک برابر سوتا رہا ہے، اور انسانیت سسکتی اور دَم توڑتی رہی ہے، لیکن اس نے مدد کا کوئی ہاتھ نہ بڑھایا، گویا وہ دنیا کے نقشے سے بالکل علیحدہ تھا۔ اس لیے مجھے کہنا چاہیے کہ مکّہ نہیں، بلکہ مکّے کا وہ عظیم الشان فرزندؐ اگر نہ ہوتا، جس نے تاریخ کے رُخ کو بدل دیا اور زندگی کے دَھارے کو موڑ دیا اور دنیا کو ایک نیا راستہ دکھایا، تو دنیا کا یہ نقشہ نہ ہوتا۔

یہ سوچتے سوچتے میری آنکھوں کے سامنے چند مناظر پھر گئے۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے قریش کا یہ سردار تن تنہا خانہ کعبہ کا طواف کررہا ہے۔ لوگ اس کا مذاق اڑا رہے ہیں، اس سے بَد زبانی کررہے ہیں، لیکن وہ انتہائی اطمینان کے ساتھ طواف کررہا ہے۔ جب وہ طواف ختم کرتا ہے تو خانہ کعبہ میں داخل ہونا چاہتا ہے، لیکن خانہ کعبہ کا کلید بردار عثمان بن طلحہ اسے سختی سے روکتا ہے۔ سردارؐ صبر سے کام لیتا ہے اور کہتا ہے: "عثمان، وہ دن بھی کیا ہوگا جب یہ کنجی میرے ہاتھ میں ہوگی، اور میں جسے چاہوں گا اسے دوں گا۔" عثمان کہتا ہے: "اس دن قریش ختم ہو چکے ہوں گے؟" سردارؐ جواب دیتا ہے: "نہیں، بلکہ اس دن انھیں حقیقی زندگی ملے گی۔"

تاریخ شاہد ہے کہ وہ شخص صرف اس کنجی کا مالک نہیں ہوا جس سے وہ خانہ کعبہ کے دروازے کو کھول سکتا تھا، بلکہ اس کے پاس وہ کنجی بھی تھی جس سے وہ انسانیت کے ان تالوں کو بھی کھول سکتا تھا جو کسی حکیم اور فلسفی سے اس وقت تک نہیں کھُل سکے تھے۔ یہ کنجی قرآن

کریم ہے جو اس پر نازل کیا گیا' رسالت ہے جو اسے سونپی گئی' جو انسانیت کی ساری گتھیوں کو سلجھا سکتی ہے اور ہر زمانے کی مشکلات کا حل پیش کرتی ہے۔

(شرق اوسط میں کیا دیکھا : اکتوبر ۱۹۴۷)

مسعود عالم ندویؒ

ہمارا قافلہ منزلِ مقصود کی طرف چل کھڑا ہوا۔ ڈیڑھ دو گھنٹہ کی مسافت ہے۔ سب کی زبانوں پر "لبیک" اور دل شوق و محبت کے جذبات سے لبریز' مگر اس گنہگار کا دل پہاڑیوں کے سلسلے ہی میں الجھا رہا۔ کتابوں کا پڑھنا یہاں کام نہیں آیا۔ کہاں یہ دشوار گزار گھاٹیاں اور صبر آزما پُرپیچ راستے اور کہاں ہمارا ناقص اندازہ ؟ بڑا فرق پایا۔ اللہ کا لاکھ لاکھ درود و سلام پاک اور برگزیدہ بندےؐ پر جس نے تکلیفیں سہ کر' جسم و جان کو خطرے میں ڈال کر' اللہ کا پیغام بندوں تک پہنچایا۔ دنیا اور دنیا والے اس ذات گرامیؐ کے احسانات کے بار سے سبکدوش نہیں ہوسکتے۔ وہ پیغام آج بھی موجود ہے' لیکن کہاں ہیں ان کا کلمہ پڑھنے والے اور ان کی محبت و عقیدت کا دَم بھرنے والے ؟

اگلے روز "لبیک" کہتے ہوئے چلے۔ دل دھڑک رہا تھا اور نگاہیں پُرشوق' ہر طرف کچھ ڈھونڈ رہی تھیں۔ راستے میں شیخ عبداللہ نے کہا : "کہو تو دعائیں بتاؤں۔" میں نے عرض کیا : "سنّت تلبیہ ہی ہے۔" آٹھ دس منٹ میں "باب السلام" پہنچ گئے۔ دل دھڑکا۔ وہ سامنے کعبہ نظر آیا۔ ہم امام مالکؒ کے مسلک پر کوئی خاص دعائیں پڑھ رہے تھے۔ سیدھے حجرِ اسود کے پاس پہنچے۔ شمع کے گرد پروانوں کا ہجوم ! یوں سارا حرم بقعۂ نور بنا ہوا تھا اور ہر طرف پروانے تھے' مگر اس نور کی بستی میں ایک سیاہ نقطہ سب سے زیادہ پُرنور نظر آرہا تھا۔ اس سیاہ نقطہ کے ایک کنارے پر پروانے گھوم گھوم کر آتے تھے۔ ہم بھی ان کفن بَردوش دیوانوں میں شامل ہوگئے۔

(دیارِ عرب میں چند ماہ : ۱۹۴۹)

قدرت اللہ شہاب

میں نے سُن رکھا تھا کہ جو شخص حرم شریف میں داخل ہوتا ہے وہ اپنا جوتا' گناہوں کی گٹھڑی' اپنی دستارِ فضیلت اور اپنی بزرگی کا عمامہ دروازے کے باہر چھوڑ جاتا ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ جب وہ باہر آئے گا تو اس کا جوتا یا اس کے گناہوں کی گٹھڑی' یا اس کی فضیلت کی دستار' یا اس کی بزرگی کا عمامہ اسّ کو واپس بھی ملے گا یا نہیں۔ بعض لوگوں کے جوتے گم ہو جاتے

ہیں، بعض لوگوں کے گناہوں کی گٹھریاں غائب ہو جاتی ہیں، بعض لوگ اپنی فضیلت اور بزرگی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ میرے پاس حرم شریف کے باہر چھوڑنے کے لیے اپنے پاؤں میں ربڑ کے چپل اور سر پر گناہوں کی گٹھری کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ میں نے دل و جان سے دونوں کو اٹھا کر باہر پھینک دیا۔

باب السّلام کے راستے حرم شریف میں داخل ہو گیا۔ اندر قدم رکھتے ہی دَم بھر کے لیے بجلی سی کوندی اور زمین کی کشش ثقل گویا ختم ہو گئی۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے گاڑی کو مضبوط بریک لگا کر میرے وجود کو پنکچر شدہ ٹائر کی طرح جیک لگا کر ہوا میں معلق کر دیا گیا ہو، جیسے میری پنڈلیوں کا گوشت ہڈیوں سے الگ ہو رہا ہو۔ میرے جسم کے اَعضا کا ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ ٹوٹ سا گیا، ہاتھ بے لوچ ہو کر لٹک سے گئے، اور سَر بھنور میں پھنسے ہوئے خَس و خاشاک کی طرح بے بسی سے چکر کاٹنے لگا۔ اس طرح اپاہج سا ہو کر میں طواف کے لیے آگے بڑھنے کے بجائے بے ساختہ لڑکھڑا کر وہیں بیٹھ گیا۔

(۷۲-۱۳ : اگست ۱۹۵۳ء)

ماہرالقادری

لیجیے حدودِ حرم سے بھی کچھ آگے نکل آئے۔ تلبیہ پڑھتے میں آنکھیں بھی زبانِ اشک سے لَے میں لَے ملا رہی ہیں۔ مکّہ کے قریب کے میدان اور پہاڑیوں کو دیکھ کر بار بار یہ خیال آرہا ہے کہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم ادھر سے ضرور گزرے ہوں گے۔ کیا عجب ہے ان وادیوں میں سرکارؐ نے بکریاں بھی چرائی ہوں۔ نہ جانے اس سرزمین کے کون کون سے قطعے ہیں جو حضورؐ کی پابوسی کے شرف کو اپنی جبینوں اور سینوں میں محفوظ کیے ہوئے ہیں!

مکّہ کی آبادی آگئی۔ رات کا وقت ہے۔ ایسے میں جو ٹیلہ، جو پہاڑی اور جو مکان بھی نظر آتا ہے، عقیدت کہتی ہے کہ اسے دل میں اتار لیجیے۔ یہ لندن اور پیرس نہیں، مکّہ مکرمہ ہے، یہ بلد امین ہے۔ ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام دونوں باپ بیٹوں نے اسی مقدّس سرزمین پر کعبہ کی بنیادیں اٹھائی تھیں، اور اس پاک اور مبارک شہر کا سب سے بڑا شرف یہ ہے کہ یہ انسانیت کے محسنِ اعظم، دنیا کے سب سے بڑے آدمی، اور نبیوں کے خاتم، محمدؐ عربی (فداہ ابی و امی) کا مولد و منشا ہے۔ زمانہ کی قدر ناشناسی اور دنیا کی غفلت کے ہاتھوں انسانی مجد و شرف کی تاریخ یا تو لوگوں نے بھلا دی تھی یا پھر اسے مسخ کر دیا تھا۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ انسانیت کی تاریخ کا پہلا ورق اسی سرزمین پر مرتب ہوا۔ اسی شہر میں حق کی وہ آواز بلند ہوئی جس نے باطل کے جسم میں

تھرتھری پیدا کردی۔ یہ تاریخی شہر نہیں بلکہ خود "تاریخ ساز" شہر ہے۔ اس شہر پر تاریخ کا ذرّہ برابر بھی احسان نہیں ہے، بلکہ خود تاریخ پر اس شہر کا احسان ہے، تاریخ اس شہر سے جانی پہچانی جاتی ہے۔ اگر تاریخ سے "مکہ" کو نکال دیا جائے تو پھر تاریخ میں رہ کیا جائے گا!

مُطوف آگے آگے ہے اور ہم حرم شریف کی طرف جا رہے ہیں ۔

پائم بہ پیش از سرا ایں کُو نمی رَود!
یاراں! خبر دہید کہ ایں جلوہ گاہ کیست

میرا پاؤں اس کوچہ سے آگے نہیں جاتا ۔ صاحبو! بتاؤ یہ کس کی جلوہ گاہ ہے۔

"باب السّلام" سے داخلہ ہوا۔ اور بیت اللہ پر نگاہ پڑتے ہی زبان پر تکبیر جاری ہوگئی!

اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ!

جلال و ہیبت اور جبروت و اُبہت کا سامنا ہے۔ ایک عالمِ گومگو اور ایک کیفیتِ بے نام، جو طاری ہوتی چلی جا رہی ہے ۔

محو کھڑا ہوا ہوں میں حُسن کی بارگاہ میں اب نہ کہیں نگاہ ہے اب نہ کوئی نگاہ میں!

یا اللہ، میں کہاں آگیا! یہ میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں! مجھ سا پلید اور حرمِ مقدّس میں! مجھ سا خطا کار، گنہ گار اور معاصی سرشت اس مقام پر جہاں ہر زمانہ کے اَتقیا و صُلحا، پاک بازوں اور نیکو کاروں نے سجدے اور طواف کیے ہیں! یہ پَیروں سے نہیں، سَر کے بل چلنے کا مقام ہے۔ یہاں کا جتنا بھی احترام کیا جائے تھوڑا ہے۔ ما، شما کا کیا ذکر ہے، اللہ کے جس گھر کا خود حضور سیّد المرسلین خاتم النّبیین علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے طواف کیا ہو، جہاں حضورؐ نے نمازیں پڑھی ہوں اور رو رو کر دعائیں مانگیں ہوں، وہاں مجھ جیسے نابکار کی حاضری ایک معجزہ سے کم نہیں اور اللہ تعالیٰ جب فضل فرماتا ہے تو ایسے معجزے ظہور میں آتے رہتے ہیں!

کہاں بلایا گیا ہوں ——— اَلْعَظْمَۃُ لِلّٰہ! ۔

کلاہِ گوشۂ دہقاں بہ آفتاب رسید
اور
اک اک قدم پہ سجدۂ شکرانہ چاہیے!

جب اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے تو نصیب اسی طرح جاگا کرتے ہیں، اور حقیر ذرّوں کو درخشانی اور ذلیل خار و خَس کو رعنائی دی جاتی ہے۔ داتا جب دینے پر آئے تو اسے کون روک سکتا ہے۔ اس کے جود و عطا ہم دنیا والوں کے قانون اور ضابطہ کے پابند نہیں ہیں، کون کہہ سکتا ہے کہ اس

شہنشاہِ حقیقی کے دربار سے کس کو کیا دیکھ کر نوازا جاتا ہے۔ جو انسان نفس اور رُوح کی ماہیت کو نہ سمجھ سکا اور خود اپنے جذبات اور محسوسات کا تجزیہ نہ کر سکا' وہ اللہ تعالیٰ کے اسرار کی پرچھائیں کو بھی بھلا پا سکتا ہے ؟ بندے کا کام صرف سمع و اطاعت ہے۔ اسرار و غیوب کے حجابات اٹھانے کی فکر میں لگے رہنا بندے کا منصب ہی نہیں ہے۔

(کاروانِ حجاز : اگست ۱۹۵۴)

نسیم حجازی

بارگاہِ خداوندی کے جاہ و جلال کے تصوّر سے لرزتا ہوا اندر داخل ہوا۔ صحن میں پاؤں رکھتے ہی خانہ کعبہ پر نظر پڑی اور مجھے اچانک ایسا محسوس ہوا کہ اس کی چھت آسمان کو چھو رہی ہے۔ سینکڑوں آدمی وہاں طواف کر رہے تھے۔ کسی کو دوسرے کی طرف دیکھنا گوارا نہ تھا۔ جو طواف سے فارغ ہو چکے تھے' ان میں سے کوئی حطیم کے اندر نفل پڑھ رہا تھا اور کوئی غلافِ کعبہ تھام کر گریہ و زاری کر رہا تھا۔ کسی کو کسی کے ساتھ سروکار نہ تھا۔ کسی کو کسی کے ساتھ دلچسپی نہ تھی --- وہ مختلف سمتوں سے آئے تھے' لیکن وہاں مشرقی اور مغربی' کالے اور گورے' امیر اور غریب' ادنیٰ اور اعلیٰ کی کوئی تمیز نہیں تھی۔ طواف شروع کیا۔ میری خود فراموشی کا یہ عالم تھا کہ کبھی چلتے چلتے میری رفتار کم ہو جاتی --- اور کبھی میرے قدم تیز ہو جاتے۔ ---

لیکن دو تین چکر لگانے کے بعد میں سنبھل چکا تھا۔ خانہ کعبہ کے گرد سات چکر پورے کرنے اور ہر بار حجرِ اسود کو بوسہ دینے کے بعد باب الرحمۃ کے سامنے دعا شروع کی۔ وہاں شاید پہلی بار یہ خیال آیا کہ میں کون ہوں اور کہاں ہوں اور اس کے ساتھ ہی میری آواز بیٹھ گئی۔ میں بڑی کوشش کے ساتھ رُک رُک کر دعائیہ کلمات دُہرا رہا تھا' لیکن اچانک میری قوتِ گویائی جواب دے گئی اور آنسوؤں کا ایک سیلاب جو نہ جانے کب سے اس وقت کا منتظر تھا' میری آنکھوں سے پھوٹ نکلا۔

یہ ایک ایسا مقام تھا' جہاں بچے کی طرح سسکیاں لینا بھی مجھے معیوب نہیں معلوم ہوتا تھا --- کسی نے میری طرف دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ کسی نے یہ نہ پوچھا کہ تم کیا کر رہے ہو۔ ان کی بے اعتنائی اور بے توجہی یہ ظاہر کر رہی تھی کہ ایک انسان کے آنسو اسی مقام کے لیے ہیں۔ ---

میں نے باب رحمت کی دہلیز پر ہاتھ پھیلا دیے اور دیر تک کھڑا رہا۔ اس وقت میرے دل میں کوئی دعا تھی تو اس کے لیے الفاظ نہ تھے۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ میرے پیچھے اور لوگ کھڑے

ہیں۔ میں نے ایک طرف ہو کر خانہ کعبہ کا غلاف تھام لیا۔ اب طبیعت قدرے ہلکی ہو چکی تھی۔ آہستہ آہستہ میری زبان سے دعائیں نکلنے لگیں۔ وہ ہاتھ جو میں نے دُعا کے لیے اٹھائے تھے' پھیلتے گئے۔ ایک گدا کے لیے ہاتھ پھیلانے کی اس سے بہتر جگہ اور کیا ہو سکتی تھی ؟ میں کبھی پاکستان کے مسلمانوں کی سربلندی کے لیے دُعا کر رہا تھا۔ کبھی کشمیر کی آزادی کا طلب گار تھا۔ کبھی ہندی مسلمانوں کی فریاد سنا رہا تھا اور کبھی الجزائر اور فلسطین کے مسلمانوں کے لیے التجائیں کر رہا تھا۔

(پاکستان سے دیارِ حرم تک: اگست ۱۹۵۹)

علی طنطاوی

جب کوئی باب السلام سے داخل ہوتا ہے اور بیت الحرام پر اس کی نظر پڑتی ہے' اور پھر وہ کعبہ اور حطیم کا طواف کرتا اور مقامِ ابراہیمؑ کو دیکھتا ہے' تو اسے اتنی زبردست خوشی حاصل ہوتی ہے کہ دنیا کی ساری خوشیاں اس کے سامنے ہیچ نظر آتی ہیں۔

یہ ہے مقامِ دوست! ہجر کی طویل راتوں کے بعد یہیں وہ آپ سے ملاقات کا منتظر ہے۔

یہیں طواف کرنے والوں کا وہ نورانی جلوس ہے جو کعبے کے اردگرد انتہائی ذوق و شوق کے ساتھ رَواں دَواں ہے۔ ہر شخص اپنے رب کو پکار رہا ہے' اس کے آگے دامنِ طلب پھیلا رکھا ہے اور وہ رب کریم ہے کہ کسی کا سوال ٹھکراتا نہیں' کسی کو خالی ہاتھ نہیں پھیرتا۔

اس وقت دل پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ حریمِ دوست کے اندر داخل ہو کر اس کے بالکل قریب جا پہنچے ہیں۔ سارے پردے اور حجاب اٹھتے چلے جاتے ہیں' اور پھر جیسے آپ کو حبیب کے رخِ روشن کی جھلک نظر آگئی ہے۔

اے لوگو' یہیں کعبے والا ملے گا۔ یہ حطیم ہے' یہ زمزم' اور یہ مقامِ ابراہیمؑ ہے۔ آپ کے خواب حقیقت بن گئے۔ آپ کی تمنائیں بر آئیں۔ دیکھو' مسلمان صف در صف حریمِ دوست کے اِردگِرد کھڑے ہیں۔ یہ صفیں حرم سے باہر ساری دنیا میں پھیلتی چلی گئی ہیں۔ یہ اس دائرے کا مرکز ہے' یہ زمین کا حقیقی محور ہے۔ یہاں دور دراز کی مسافتیں اور فاصلے سمٹ کر رہ جاتے ہیں۔ ملک اور قومیں ایک ہو جاتی ہیں۔ یہاں مشرق بھی ہے اور مغرب بھی' زمین کے قریب ترین مقامات بھی ہیں اور بعید ترین گوشے بھی۔

(من نفحات الحرم: ۱۳۷۰ھ: مئی ۱۹۶۱)

شورش کاشمیری

بیت اللہ کے چاروں طرف غلاف چڑھا ہوتا اور اس پر آیات قرآنی منقش ہوتی ہیں۔ حرم کی روشنیوں کے ہالے میں غلاف اتنا بھلا معلوم ہوتا ہے کہ بھلا کے لفظ کا اس سے بہتر استعمال ہی نہیں۔ ایک عمارت ایک عبا پہن کر کھڑی ہے' جس سے سطوت' عظمت اور حشمت ٹپکتی ہے۔ دنیا میں کوئی عمارت ایسی نہ ہوگی جو ہر دَور کی ہر ساعت میں لوگوں کا مرکز ہو۔ اور جہاں دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں کوئی ثانیہ طواف کے بغیر نہ گزرتا ہو' روشنیوں نے کعبتہ اللہ کو اس طرح جگمگا رکھا ہے کہ ہر لحظہ بُقعۂ نور نظر آتا ہے۔ رات کو یہ منظر اور بھی دل کش ہو جاتا ہے۔ آس پاس کے پہاڑوں سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین نُور اُگل رہی ہے۔ چاروں طرف روشنیاں ہی روشنیاں ہیں۔ مسجد الحرام اور بیت اللہ میں کسی انسان کے لیے کوئی امتیاز نہیں۔ شاہ و فقیر سب برابر ہیں۔ یہ عشق کا دربار ہے اور عشق کے دربار میں کسی ابوالفضل و فیضی کے لیے جگہ نہیں۔ فرق ہے تو صرف اللہ سے لَو لگانے والوں کے مراتب و مناقب میں ہے۔ جہاں دولت یا حکومت کے لیے کوئی اعزاز نہیں' اعزاز ان کے لیے ہیں جن کے سَر اور جن کے دِل اللہ کے حضور میں اس طرح جھکے رہتے ہیں کہ اوپری نگاہیں اور رسمی طبعیتیں ان تک پہنچ ہی نہیں پاتی ہیں۔ ہر شخص اپنی لَو میں مگن رہتا اور عشق و ایمان سے بقدر ظرف بہرہ یاب ہوتا ہے۔ حاضری میں یکسانی ہے حضوری میں نہیں' بہ قول شاعر۔

عشق کی چوٹ تو پڑتی ہے دلوں پر یکساں
ظرف کے فرق سے آواز بدل جاتی ہے

(شب جائے کہ من بودم: ۱۹۶۹)

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر

حرم شریف کا حسین و منوّر منظر اگرچہ جنّت نگاہ تھا' لیکن اسے دیکھتے ہی دِل بھَر آیا' آنکھوں سے جوئے اشک رَواں ہوگئی' اور رُوح "دوست" کی دید و حضوری کے لیے ماہیِ بے آب کی طرح تڑپنے لگی۔ ہم نے ارشادِ نبویؐ کی مطابعت میں احرام باندھے' باب السّلام سے گزر کر' بنی شیبہ کے راستے' حرم شریف میں داخل ہوئے' تو ہماری نظریں خانہ کعبہ پر پڑیں اور وہیں مرتکز ہوگئیں۔ یہ میرے اِلٰہ و ربّ کا گھر تھا' جو جلوۂ حُسن و نُور اور جنّتِ اہلِ نظر تھا۔ اسے صدیوں پہلے سیّدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے' جو پیغمبرِ صدق و وَفا اور خلیل اللہ تھے' اپنے ربِّ جلیل کے حکم سے اپنے فرزند صالح و فرماں بردار اور پیغمبرِ تسلیم و رضا' حضرت اسماعیل علیہ السلام کے

تعاون سے تعمیر کیا تھا۔

حرم شریف بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ اس نور میں نورِ ملکوتی اور حسنِ الٰہی کے رنگ کا امتزاج بھی تھا' اس لیے ایمان انگیز و بصیرت افروز' دلکش و جاں آفریں' نظر افروز و سرور آگیں' اور کیف پرور و سحر انگیز تھا۔ اہلِ جذب و شوق پر عجب وارفتگی کا عالم تھا۔ وہ تلاشِ "دوست" میں سرگرداں و آشفتہ سر دکھائی دیتے تھے۔ کچھ سعی کرنے میں مشغول تھے' تو بعض ذکر و اذکار اور تلاوت کرنے میں منہمک تھے' لیکن کثرت ان عشاق کی تھی جو "دوست" کی بلائیں لینے اور اس پر فدا ہو جانے کی تمنا میں طواف کر رہے تھے۔ ان کا "دوست" کے گھر کے اِردگِرد گھومنا' گریہ و زاری اور الحاح و فریاد کرنا' اور خشوع و خضوع سے دعائیں مانگنا' سوزِ عشق و مستی کا ایسا سچا اور رقت انگیز نظارہ تھا کہ مجھ پر بھی یہی کیفیتِ جذب و جنوں طاری ہوگئی۔ "دوست" آنکھوں سے نہاں تو تھا' لیکن دیدۂ دل پر جلوہ فگن بھی تھا۔ نظر اسے دیکھ تو نہیں سکتی تھی' لیکن اس کی موجودگی کا احساس بھی ہوتا تھا۔ روح کے جذب و شوق اور وارفتگی و شیفتگی سے ایسا تاثر ملتا تھا جیسے "دوست" اپنے عشاق میں موجود انھیں دیکھ رہا ہے۔ "دوست" حقیقتِ گریز پا کی طرح ظاہر بھی تھا اور نہاں بھی' اور اہلِ جذب و شوق اس کی طلب و جستجو میں دیوانے ہو رہے تھے' اور ان کی یہ دیوانگی "اس" کی نظر میں اتنی عظیم و عزیز ہوتی ہے کہ اس پر ہزاروں فرزانوں کی فرزانگی قربان کردی جائے۔

ہم عشا کی نماز اور نوافل پڑھ کر فارغ ہوئے' تو طواف کرنے کے لیے ہجومِ عشاق میں شامل ہوگئے۔ نور کی بارش اور ملکوتی سائے اگر جنت نگاہ تھے' تو تسبیح و تمجید اور حمد و ثنا کی دل گداز صدائیں فردوسِ گوش تھیں۔ مرد و زن اور پیر و جواں' اپنے معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود کے گھر کے گرداگرد عالمِ سرمستی میں پروانہ وار گھوم رہے تھے۔ کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا۔ سب دنیا و مافیہا سے بے نیاز "کوئے دوست" میں اس کی طلب و جستجو میں سرگرداں تھے۔ حرم شریف حقیقت میں "کوئے دوست" ہے' جس میں عشاق اس کے قرب و وصال اور دید و حضوری کی آرزو میں دیدۂ شوق فرشِ راہ کیے ہوئے تھے۔ سب کی نظریں "دوست" کے گھر پر مرتکز تھیں' جس کا دیکھنا عبادت' اور اس کا صلہ آنکھوں کی ٹھنڈک' نفس کی طمانیت اور روح کا سرور ہے۔ اس پر اہلِ نظر کی ہر نگہِ محبت کا اجر بے حساب ہے۔ نظر اس پر پڑتی تو شہیدِ نظارہ ہو جاتی ہے' اور اس شہادتِ نظر کا صلہ بھی سرورِ جاودانی ہے۔ یہ راز شہیدِ نظارہ ہی جانتے ہیں۔

(رودادِ سفرِ حجاز ۱۳۹۹)

فرید احمد پراچہ

باب عباس سے حرم شریف میں داخل ہوئے تو نگاہوں کے سامنے خدا کا گھر موجود تھا۔ جس کی طرف منہ کرکے ہم نمازیں پڑھتے رہے وہ آج نگاہ ہی نہیں لمس کی قربت کے فاصلے پر موجود ہے۔ اللہ اللہ کتنی خوش نصیبی ہے۔ جس گھر کو دیکھنے کی تمنائیں کرتے تھے' قلب و نظر کا وہ قبلہ آج نظروں میں سما رہا ہے' نگاہیں ہیں کہ ہٹتی ہی نہیں' دل ہے کہ بے تابی سے دھڑک رہا ہے' احساس ہے کہ مجرم بن کر سامنے آرہا ہے۔ حضور سرور کائنات ؐ نے فرمایا ہے کہ خانہ کعبہ پر پہلی نظر پڑتے ہی جو دعا مانگی جائے وہ لازماً قبول ہوتی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ سے کسی نے پوچھا' اس موقع پر کیا دعا مانگنی چاہیے' آپ نے فرمایا کہ خدا سے اپنے مستجاب الدعوات ہونے کی دعا مانگنی چاہیے تاکہ اس کے بعد جو بھی دعا کی جائے قبول ہو جائے۔ امام اعظمؒ کی نکتہ آفرینی میں کتنی حقیقت ہے' کتنی زندگی ہے' لیکن خانہ کعبہ پر پہلی نظر کے سے مجھے تو سب کچھ بھول گیا' الفاظ دھندلا گئے' عرض مدعا اور حرف دعا تک یاد نہ رہے' حتیٰ کہ اپنی ذات کا شعور بھی نہ رہا۔ خانۂ خدا سے نگاہیں ہٹتی ہی نہیں۔ مکہؐ کے انتہائی نشیب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تعمیر کردہ خدا کا یہ پہلا گھر دنیا کی ہر بلندی سے زیادہ بلند ہے۔ لوگ اس کے ارد گرد والہانہ طواف کر رہے تھے۔ ہم بھی اس سیل شوق میں شامل ہو گئے۔

(سفر شوق: ۱۹۸۱)

زبیدہ حیؒ

اقبال صاحب نے ایک جانب اشارہ کیا "وہ رہا حرم کعبہ۔" میں نے پلٹ کے دیکھا --- جیسے بادلوں سے چاند نکل آیا --- وہ چاند جس کی ضیا سے ایماندار دل منور ہیں' جس کی میٹھی روشنی سے مایوسیوں کی تیرگی چھٹ جاتی ہے۔

میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ایک عجیب احساس طاری ہو گیا' جیسے کوئی دیہاتی کسی انتہائی رعب و تمکنت والے شہنشاہ کے عالی دربار میں آ نکلے اور آداب شاہی سے قطعی ناواقف ہو ---

یہ سنگ مرمر کی نہایت عظیم الشان فقید المثال عمارت ہے' دودھیا اور سرمئی رنگ کی ہلکی دھاریاں ہیں' سنگ مرمر طویل جالیوں اور سلوں کی شکل میں دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔ سنہری منقش اور چوبی دروازے' بلکہ وسیع و عریض و لاتعداد دروازے' جو اس عالی مرتبت عمارت کی کشادگی کا واضح ثبوت ہیں' چاند تاروں اور خانۂ اقدس کی قابل دید روشنی میں نہائے ہوئے تھے۔

گویا آسمانی نور، زمینی نور پر پھیلا ہوا تھا کہ خانہ کعبہ ایک نور ہے، بھٹکے ہوؤں کے لیے راہِ راست ہے، یعنی نُورٌ عَلیٰ نُور (روشنی پر روشنی) نور پر نور کی بارش میں مجھے یہ پوری عمارت گول نظر آئی۔...

ربِّ لاشریک کی یہ مسجد اپنے حُسن میں لاثانی ہے۔ اس کے جمال و جلال کی مظہر خوبصورت ترین مسجد کو دیکھ کر میری چلنے جلنے کی سکت بھی جاتی رہی۔ یہ وہ حُسن ہے جو محسوس کیا جاسکتا ہے بتایا نہیں جاسکتا۔ یہ وہ جاذبیت ہے جو سیدھی دل میں اتر جاتی ہے۔ بے اختیار دل سے نکلا "اے اللہ اس کا مالک تو تو ہی ہو سکتا ہے۔ اتنا عظیم گھر تو تیرا ہی ہو سکتا ہے۔ اس عمارت اور عالی شان گھر کو زیب دیتا ہے کہ منبعِ برکات و فیوض اور سرچشمۂ رحمت کی وجہ سے تیرا گھر کہلائے۔

(زادِ نصیب ۱۰۰-۱۰۱:۱۹۸۱)

سفرِ شوق

اپنے گھر سے بیت اللہ تک

سید ابوالحسن علی ندوی

روانگی

اللہ اللہ کر کے روانگی کی تاریخ آئی ؎

دن گنے جاتے تھے جس دن کے لیے

جس دن کی آرزو لے کر لاکھوں اللہ کے نیک اور مقبول بندے دنیا سے چلے گئے، ہزاروں اولیاء اللہ عمر بھر اسی حسرت و اشتیاق میں رہے، وہ ایک ظلوم و جہول بندہ کو نصیب ہو رہا ہے۔ ؎

برایں مژدہ گر جاں فشانم رواست

اس خوش خبری پر اگر جان نثار کروں تو بجا ہے۔

بہت چاہا کہ سوائے چند مخصوص دوستوں کے کسی کو خبر نہ ہو۔ ایسے موقع پر ریا و عُجب (خود پسندی) سے حفاظت اور اخلاص کامل کا بڑا اونچا مقام اور اللہ کے مخلص بندوں کا کام ہے۔

اگر سفر کی بسم اللہ ہی غلط ہوئی، اور اخلاص میں فرق آیا تو بڑا خطرہ ہے ؎

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

معمار اگر بنیادی اینٹ ہی ٹیڑھی رکھ دے تو آسمان تک دیوار ٹیڑھی ہی جائے گی۔

لیکن ایک سے دوسرے کو، دوسرے سے تیسرے کو خبر ہو ہی گئی۔ اے اللہ، دل کا نگہبان تو ہی ہے، اپنی ناکارگی، گناہوں اور شامتِ نفس کا پورا استحضار، اور تیرے بے استحقاق احسان کا مراقبہ رہے، ایک لمحہ کے لیے بھی اپنی اہلیت و مقبولیت کا وسوسہ اور ریا کا ادنیٰ شائبہ بھی آنے نہ پائے۔

اللّٰھُمَّ اِنَّ قُلُوْبَنَا وَنَوَاصِیَنَا وَجَوَارِحَنَا بِیَدِکَ، لَمْ تُمَلِّکْنَا مِنْھَا شَیْئًا، فَاِذَا فَعَلْتَ ذٰلِکَ بِنَا،

لَكِنْ اَنْتَ وَلِيُّنَا وَ اهْدِنَا اِلٰى سَوَاءِ السَّبِيْلِ۔

اے اللہ ہمارے دل' ہماری پیشانی کے بال' ہمارے اعضا و جوارح سب تیرے ہاتھ میں ہیں' تو نے اس میں سے کوئی چیز بھی ہمارے اختیار میں نہیں دی' جب واقعہ یہ ہے تو پھر تو ہی ہمارا کارساز رہ' اور ہم کو سیدھے راستے پر لگا۔ . . .

لیجیے دیکھتے دیکھتے چلنے کا وقت آگیا۔ مکروہ وقت نہیں ہے۔ ہر سفر کا آغاز دو رکعت نفل اور دُعاءِ سفر سے مسنون ہے' نہ کہ اتنا طویل' مبارک اور نازک سفر' جس میں ہر آن خطرہ پونجی کے ڈوب جانے اور قلب و نیت کے قزاقوں کی رہزنی کا ہے۔ ساری عمر کا خشوع اگر اس ایک نماز میں' اور زندگی بھر کا تضرّع اگر آج کی دُعا میں' آ جائے تو بڑی بات نہیں۔ جسم و جان' قلب و ایمان' برّ و بحر کے خطرے اس ایک سفر میں جمع ہیں۔ ہار جیت کا سفر ہے۔ ہار بھی ایسی کہ اس کے برابر کوئی ہار نہیں۔ اللہ کے گھر جائے' اور اپنی شامتِ اعمال سے خالی ہاتھ آئے' بلکہ گناہوں کی گٹھری اور اُلٹی پیٹھ پر لاد کر لائے۔

تھیں چند اپنے ذمے دھر چلے
کس لیے آئے تھے اور کیا کر چلے

اور جیت بھی ایسی کہ کوئی فتح اور کامرانی اس کے برابر نہیں' گناہوں سے پاک صاف دھویا دھلایا جیسے آج ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا۔

مَنْ حَجَّ لِلّٰهِ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ اُمُّهُ (بخاری و مسلم)

جس شخص نے محض اللہ کی خوشنودی کے لیے حج کیا اور بے حجابی اور گناہ سے محفوظ رہا تو وہ پاک ہو کر ایسا لوٹتا ہے جیسا کہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کے روز تھا۔

وہ سفر' جس کا انعام جنت ہے۔

اَلْحَجُّ الْمَبْرُوْرُ لَيْسَ لَهُ الْجَزَاءُ اِلَّا الْجَنَّةُ (بخاری و مسلم)

حج مقبول کی جزا جنت ہی ہے۔

اس سفر کے لیے جو کچھ بھی مانگا جائے اور جس طرح دل کھول کر مانگا جائے کم ہے۔ مگر ناتجربہ کار عقل' پریشان دماغ' مضطرب دل' تھکا ہوا جسم' وقت تھوڑا کتنا بہت' کہیں ایسا نہ ہو کہ غیر ضروری باتیں زبان پر آ جائیں اور ضروری باتیں رہ جائیں۔ لیکن قربان رحمتہ اللعالمین (صلی اللہ علیہ وسلم) کے' کہ جیسے ہر دینی و دنیاوی ضرورت کے لیے جنچی تلی دعائیں اور ہر شعبۂ زندگی کے لیے منتخب دعائیہ الفاظ اُمّت کو عطا کر گئے' سفر کی بھی ایسی مکمل دعا تعلیم کر گئے جس میں نہ

کسی اضافہ کی ضرورت ہے نہ کسی ترمیم کی۔ اور صدہا احسانات کے ساتھ اس احسان کا بھی استحضار کرکے ' محبت و عظمت کے ساتھ درود پڑھ کر ' یہ مسنون و ماثور الفاظ کہے۔

اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْاَلُکَ فِیْ سَفَرِنَا ھٰذَا الْبِرَّ وَالتَّقْوٰی ' وَمِنَ الْعَمَلِ مَا تَرْضٰی۔ اَللّٰھُمَّ ھَوِّنْ عَلَیْنَا سَفَرَنَا ھٰذَا ' وَاطْوِعَنَّا بُعْدَہٗ۔ اَللّٰھُمَّ اَنْتَ الصَّاحِبُ فِی السَّفَرِ ' وَالْخَلِیْفَۃُ فِی الْاَھْلِ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ وَعْثَآءِ السَّفَرِ وَکَاٰبَۃِ الْمَنْظَرِ ' وَسُوْءِ الْمُنْقَلَبِ فِی الْمَالِ وَالْاَھْلِ وَالْوَلَدِ۔ (مسلم)

اے اللہ ' ہم تجھ سے اس سفر میں نیکی اور تقویٰ کے طالب ہیں ' اور ایسے اعمال کے جو تجھے پسند ہوں۔ اے اللہ ' ہمارے سفر کو ہمارے لیے آسان اور ہلکا بنا دے ' اور اس کی مسافت کو لپیٹ دے۔ اے اللہ ' تو سفر میں بھی ہمارے ساتھ ساتھ ہے ' اور گھر میں بھی ہمارے پیچھے نگراں اور خیال رکھنے والا ہے۔ اے اللہ ' میں تجھ سے سفر کی کلفت ' اور ایسی چیز سے پناہ چاہتا ہوں جس کے دیکھنے سے کوفت ہو ' اور مال و اہل و عیال کی طرف بری واپسی سے۔

گھر سے رخصت ہوئے ' سب کو اللہ کے حوالہ کیا ' اور اللہ کے حفظ و امان میں دیا۔ رخصت کرنے والوں نے بھی مسنون الفاظ میں اللہ کے گھر کے مسافر کو اللہ کی ودیعت و حفاظت میں دیا ' اور کہا:

اَسْتَوْدِعُ اللّٰہَ دِیْنَکَ وَاَمَانَتَکَ وَخَوَاتِیْمَ اَعْمَالِکَ۔

میں اللہ کی امانت میں دیتا ہوں ' تمھارا دین اور تمھاری امانت اور تمھارے اعمال کا انجام۔

ں وقت گھر سے نکلے سفر شروع ہوگیا ' اور زبان پر یہ مسنون الفاظ آگئے ' جو بالکل مناسب حال ہیں '

اَللّٰھُمَّ بِکَ اَنْتَشَرْتُ ' وَاِلَیْکَ تَوَجَّھْتُ ' وَبِکَ اعْتَصَمْتُ ' وَعَلَیْکَ تَوَکَّلْتُ۔ اَنْتَ ثِقَتِیْ ' وَاَنْتَ رَجَائِیْ۔ اِکْفِنِیْ مَا اَھَمَّنِیْ ' وَمَا لَا اَھْتَمُّ بِہٖ ' وَمَا اَنْتَ اَعْلَمُ بِہٖ مِنِّیْ۔ عَزَّجَارُکَ ' وَجَلَّ ثَنَائُکَ ' وَلَا اِلٰہَ غَیْرُکَ اَللّٰھُمَّ زَوِّدْنِیَ التَّقْوٰی ' وَاغْفِرْلِیْ ذُنُوْبِیْ ' وَوَجِّھْنِیْ لِلْخَیْرِ اَیْنَمَا تَوَجَّھْتُ۔

اے اللہ میں تیرے سہارے چل کھڑا ہوا ہوں اور تیری طرف رخ کر دیا ہے اور تجھے مضبوط پکڑ لیا ہے اور تجھ پر بھروسہ کیا ہے۔ تو ہی میرا سہارا ہے ' تو ہی میرا آسرا ہے۔ جس چیز کی مجھے فکر ہے اور جس کی مجھے فکر نہیں اور جس کو تو زیادہ جانتا ہے ' سب کا تو خود ہی انتظام فرما دے ' تیرے جوار میں آنے والا غالب و محفوظ ہے۔ تیری مدح و توصیف بلند ہے ' تیرے سوا کوئی معبود نہیں ' تقویٰ کو میرا زادِ راہ بنا۔ میرے گناہوں کو

معاف فرما' اور جس طرف رُخ کروں خیر ہی کی طرف میرا رُخ کر۔

گاڑی آگئی' مسافروں کو ایذا دیے بغیر سوار ہوئے' سامان کو قرینہ سے رکھا' بقدر ضرورت جگہ گھیری' وضو اور نماز کا انتظام کرلیا۔ سفر کے اس ہنگامہ اور شوروغل میں بھی اپنے سفر کی عظمت اور اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف توجہ' اپنی بے بسی کا احساس قائم ہے۔ لوگوں سے محبت کے ساتھ رخصت ہوئے' اور سفر کی کامیابی اور مقبولیت کے لیے خود ان سے دعا کی درخواست کی۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اللہ کے ان سادہ دل بندوں میں کتنے مقبولِ بارگاہ ہوں گے' اور کتنوں کے جسم یہاں اور دِل وہاں ہوں گے' اور کتنے بہت سے حُجّاج سے افضل ہوں گے۔۔۔

صلاح ہوئی کہ یہ ہفتہ اپنی تیاری اور حجاج کی خدمت گزاری میں صرف ہو۔ سنا ہے کہ جس نوع کی خدمت مسلمانوں کی کی جائے اسی نوع کی مدد اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ جو مسلمان کو روٹی کھلائے گا اللہ اس کی روٹی کا انتظام فرمائے گا' جس کو مسلمانوں کی نماز کی فکر ہوگی اللہ اس کی نماز کی حفاظت اور اس کی ترقی کا انتظام فرمائے گا۔ اس لیے اگر حجاج کے حج کی صحت اور اس کی روح کی فکر کی جائے گی' تو ہمیں بھی اپنے حج کی مقبولیت اور اس کی روحانیت کی امید کرنی چاہیے۔ اَللّٰہُ فِی عَوْنِ الْعَبْدِ مَا کَانَ الْعَبْدُ فِی عَوْنِ اَخِیْہِ' جب تک ایک شخص اپنے بھائی کی مدد میں رہتا ہے' اللہ تعالیٰ اس کی مدد میں رہتا ہے۔۔۔

سفرِ عشق و محبت

حج کے دو مستقل شعبے ہیں۔ ایک ضوابط و قوانین کا' جس میں مومن کی اِطاعت و اِنقیاد کا امتحان اور مظاہرہ ہے۔ ایک محبت و عشق کا' جس میں اس کی عاشقانہ کیفیت اور والہانہ محبت کا ظہور مطلوب ہے۔ اور سچ پوچھیے تو حج کی رُوح اور حضرت ابراہیمؑ کی میراث یہی عشق و محبت ہے۔ حج میں انھی دبی ہوئی چنگاریوں کا اُبھارنا اور اسی محبت کی تربیت و ترقی مقصود ہے۔ بعض طبیعتوں کے خمیر میں عشق و محبت داخل ہوتی ہے۔ ان کو حج سے فطری مناسبت ہوتی ہے' اس کی سب مشکلات ان کے لیے آسان اور اس کے سب مناسک و ارکان ان کی روح کی غذا اور ان کے درد کی دوا ہوتے ہیں۔ اگر یہ محبت و عشق فطری نہیں اور طبیعت خشک اور قانونی محض واقع ہوئی ہے' تو مناسب ہے کہ اِکتسابی طریقہ سے کسی نہ کسی درجہ میں محبت کی حرارت پیدا کی جائے۔ اس لیے کہ اس کے بغیر بعض اوقات حج ایک قالبِ بے روح ہو کر رہ جاتا ہے۔

محبت میں اِکتساب کو اچھا خاصا دخل ہے۔ اس کے دو آزمودہ طریقے ہیں۔ ایک محبوب کے جمال و کمال اور اس کے محاسن و کمالات کا مطالعہ و مراقبہ۔ دوسرے اہلِ محبت کی صحبت' اور اگر

وہ میسر نہ ہو تو ان کے عاشقانہ واقعات۔ حج سے مناسبت پیدا کرنے کے لیے یہ دونوں راستے ممکن ہیں۔ پہلے کا ذریعہ تلاوت اور ذکر و تفکر ہے۔ دوسرے کا ذریعہ عُشاق و محبین اور شہیدانِ محبت کے پُر اثر واقعات ہیں' جس میں صدیاں گزر جانے کے بعد بھی تازگی اور گرمی باقی ہے' اور اب بھی وہ دِلوں کی سرد انگیٹھیاں گرما دیتے اور بجھے ہوئے دلوں کو تڑپا دیتے ہیں۔ شیخ دہلوی کی جذب القلوب اور شیخ الحدیث سہارنپوری کی فضائلِ حج نیز حضرت جامی و خسرو کی عاشقانہ غزلیں اور نعتیہ کلام اس مقصد کے لیے بہت مفید ہے۔

اگر محبت کی یہ گرمی اور سوز' فطری یا کسبی طور پر موجود ہے' تو روز بروز منزل کی کشش بڑھے گی۔ جب اس سرزمینِ مقدّس کی جلی ہوئی پہاڑیاں اور تپتی ہوئی ریت دُور سے کہیں کہیں دکھائی دے گی' جس میں کوئی مادی کشش اور کوئی ظاہری حُسن نہیں' تو سَو جان سے اس پر قربان ہو جانے کا جی چاہے گا' اور اس کے ذرہ ذرہ میں دل آویزی اور محبوبیت معلوم ہوگی۔ . . .

جدّہ میں

وقت گزرتے دیر نہیں لگتی . . . حجّاج بادبانی کشتیوں اور موٹر لانچ کے ذریعہ جدہ کے پلیٹ فارم پر' یعنی عرب کی سرزمین پر پہنچ گئے۔

هٰذَا الَّذِی کَانَتِ الاَیَّامُ تَنْتَظِرُ ‏ ‏ ‏ ‏ فَلْيُوفِ لِلّٰہِ اَقْوَامٌ بِمَانَذَرُوْا

ہاں' اسی گھڑی کا دنوں کو انتظار تھا۔ اب لوگ وہ نذریں پوری کریں جو اللہ کے لیے مانی ہیں۔

دل سینہ سے نکلا جاتا ہے' کیا واقعی ہم عرب کی سرزمین پر ہیں' کیا ہم اب دیارِ محبوبؐ میں ہیں' کیا ہم مکہ مُعظمہ سے چند میل کے فاصلہ پر ہیں؟ ؏

پیاسیتم بہ بیداریست یارب یا بخواب

اے خدا' جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں' یہ نیند کا عالم ہے یا بیداری کا۔

اللہ اللہ درودیوار سے عاشقیت ٹپکتی ہے۔ مکہ مُعظمہ ابھی دُور ہے' اور مدینہ طیبّہ اس سے بھی دُور۔ جدّہ کوئی مقدّس مقام نہیں۔ نہ یہاں بیت اللہ نہ یہاں مسجد نبویؐ' نہ یہ حرمِ ابراہیمؑ' نہ یہ حرمِ رسولؐ' لیکن محبت کا آئین نرالا ہے۔ اس کو کیا کیجیے کہ جدّہ کی گلیوں سے بھی اُنس اور محبت معلوم ہوتی ہے۔ غریب الدیار مسافر کو یہاں پہنچ کر بوئے اُنس آئی' برسوں کی محبت نے اپنی پیاس بجھائی۔ محبت' فلسفہ اور قانون سے آزاد ہے۔ یہاں کے قُلی اور مزدور' سیاہ فام سوڈانی' اور پیراہن دریدہ بدّو بھی دل کو اچھے لگتے ہیں۔ یہاں کے دکانداروں' خوانچہ فروشوں کی صدائیں' معصوم بچیوں اور بچوں کی گیتیں' جن میں وہ حجّاج سے سوال کرتے ہیں' دل میں اتری چلی جاتی

ہیں۔ محبت عقل کو تنقید کی فرصت ہی نہیں دیتی' اور اچھا ہے کہ کچھ دن اس کو فرصت نہ دے۔

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

مدینہ کی طرف

موٹر روانہ ہوئی۔ راستہ میں درود شریف سے بہتر کیا وظیفہ اور مشغلہ ہے۔ نمازوں کے اوقات میں موٹر روکی گئی' اذان و جماعت کے ساتھ نماز ہوئی۔ منزلیں آئیں اور گزر گئیں۔ غربت کے مارے نیم برہنہ عرب بچے اور بچیاں' جن کے جسم پر کپڑوں کے تار اور دھجیاں تھیں' موٹر کا دُور تک تعاقب کرتیں اور آخر تھک کر رہ جاتیں۔ ان کی غربت کو دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان میں کتنے صحابہ کرامؓ کی اولاد اور عراق و شام کے فاتحین کی نسل میں سے ہیں۔ ایمانی اور مادی حیثیت سے اگر کوئی شہزادہ کہلانے کا مستحق ہے تو ساری دنیا کے یہ شہزادے اور دنیائے اسلام بلکہ عالمِ انسانیت کے محسنوں اور مخدوموں کی اولاد ہیں۔ بے حقیقت سکوں کے ساتھ جو آپ اپنی حقیر خواہشات میں بے دریغ خرچ کرتے رہتے ہیں' اگر آنسو کے چند قطرے بھی آپ بہا دیں تو شاید گناہوں کا کچھ کفارہ ہو جائے۔

نظر اٹھا کر دیکھیے' یہ دونوں طرف پہاڑوں کی قطاریں ہیں' کیا عجب ہے کہ ناقۂ نبویؐ اسی راستہ سے گزری ہو۔ یہ فضا کی دلکشی یہ ہوا کی دل آویزی اسی وجہ سے ہے ۔

اَلَا اِنَّ وَادِی الْجِزْعِ اَضْحٰی تُرَابُہٗ مِنَ الْمِسْکِ کَافُوْرًا وَاَعْوَادُہٗ رَنْدًا
وَمَا ذَاکَ اِلَّا اَنَّ ہِنْدًا عَشِیَّۃً تَمَشَّتْ وَ جَرَّتْ فِی جَوَانِبِہٖ بُرْدًا

ہاں' جزع کی وادی کی مٹی روشن ہے' کافور کی مشک سے۔ وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ شام کے وقت ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کی طرح یہاں سے ہند کا گزر ہوا ہے۔

لیجیے' مسجد آگئی۔ اب بیرِ علی (ذوالحلیفہ) کی باری ہے ۔

منزلِ دوست چوں شود نزدیک آتشِ شوق تیز تر گردد!

محبوب کی منزل جیسے جیسے نزدیک آتی جاتی ہے' محبت کی آگ تیز ہوتی جاتی ہے۔

درود شریف زبان پر جاری ہے' دل وفورِ شوق سے امنڈ رہا ہے' عرب ڈرائیور حیران ہے کہ یہ عجمی کیا پڑھتا ہے اور کیوں روتا ہے' کبھی عربی میں گنگناتا ہے' کبھی دوسری زبانوں میں شعر پڑھتا ہے۔

بھینی بھینی ہوا ہے اور ہلکی ہلکی چاندنی، جس قدر طیبہ قریب ہوتا جارہا ہے ہوا کی خنکی، پانی کی شیرینی اور ٹھنڈک، لیکن دل کی گرمی، بڑھتی جارہی ہے۔ سنیے، کوئی کہہ رہا ہے ۔

بادِ صبا جو آج بہت مشکبار ہے ۔۔۔ شاید ہوا کے رخ پہ کھلی زلفِ یار ہے

وہ ایک بار ادھر سے گئے مگر اب تک ۔۔۔ ہوائے رحمتِ پروردگار آتی ہے

عجب کیا گر مہ و پرویں مرے نخچیر ہو جائیں ۔۔۔ کہ بر فتراکِ صاحب دولتے بستم سرِ خود را

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے ۔۔۔ غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیِ سینا

خاکِ یثرب از دو عالم خوشتر است ۔۔۔ اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

یثرب کی خاک دونوں جہانوں سے اچھی ہے۔ کتنا پیارا شہر ہے جہاں محبوب کا بسیرا ہے۔

داغِ غلامیت کرد رُتبۂ خسرو بلند ۔۔۔ میرِ ولایت شود بندہ کہ سلطاں خرید

آپؐ کی غلامی کے داغ نے خسرو کا مرتبہ بلند کردیا۔ وہ غلام جسے بادشاہ خریدلے، مملکت کا مالک بن جاتا ہے۔

محمدؐ عربی کآ بروئے ہر دو سرا ست ۔۔۔ کسے کہ خاکِ درش نیست خاک بر سرِ او

محمدؐ عربی، دونوں جہانوں کی آبرو ہیں، جو ان کے در کی خاک نہیں بنتا، اس کے سر پر خاک۔

مدینہ طیبہ میں

لیجیے ذوالحلیفہ آگیا، رات کا بقیہ حصہ یہاں گزارنا ہے۔ غسل کیا، خوشبو لگائی۔ کچھ دیر دم لے لیجیے اور کمر سیدھی کرلیجیے۔ صبح ہوئی، نماز پڑھی، موٹر روانہ ہوئی۔ کیا جہاں سَر کے بَل آنا چاہیے تھا وہاں موٹر پر سوار ہو کر جائیں گے؟ ڈرائیور کے ساتھ بیٹھنا کام آیا، "وادیِ عقیق" میں "بئرِ عروہ" کے پاس اتار دے گا۔۔۔

بسم اللہ، اتریئے۔ وہ دیکھیے جبلِ اُحد نظر آرہا ہے۔ ذٰلِکَ جَبَلٌ یُحِبُّنَا وَنُحِبُّہٗ، یہ پہاڑ ہم سے محبت کرتا ہے، اور ہم اس سے۔ وہ سوادِ مدینہ کے درخت نظر آئے! کیا یہ وہی درخت ہیں جن کے متعلق شہیدی مرحوم نے کہا تھا۔

تمنا ہے درختوں پر ترے روضہ کے جا بیٹھے ۔۔۔ قفس جس وقت ٹوٹے طائرِ روحِ مقیّد کا

وہ گنبدِ خضرا نظر آیا! دل کو سنبھالیے، اور قدم اٹھائیے۔ یہ لیجیے کہ مدینہ میں داخل ہوئے، مسجدِ نبویؐ کی دیوار کے نیچے نیچے بابِ مجیدی سے گزرتے ہوئے بابِ جبریل پر جاکر رُکے۔ حاضری کے شکرانہ میں کچھ صدقہ کیا اور اندر داخل ہوئے۔ پہلے محرابِ نبویؐ میں جاکر دوگانہ ادا کیا، گنہگار

آنکھوں کو جگر کے پانی سے غسل دیا، وضو کرایا، پھر بارگاہِ نبویؐ پر حاضر ہوئے۔

اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ، اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا نَبِیَّ اللّٰہِ، اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا حَبِیْبَ اللّٰہِ، اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا صَاحِبَ الْخُلُقِ الْعَظِیْمِ، اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا رَافِعَ لِوَاءِ الْحَمْدِ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ، اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا صَاحِبَ الْمَقَامِ الْمَحْمُوْدِ، اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا مُخْرِجَ النَّاسِ بِاِذْنِ اللّٰہِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ، اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا مُخْرِجَ النَّاسِ مِنْ عِبَادَۃِ الْعِبَادِ اِلٰی عِبَادَۃِ اللّٰہِ وَحْدَہٗ، اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا مُخْرِجَ النَّاسِ مِنْ جَوْرِ الْاَدْیَانِ اِلٰی عَدْلِ الْاِسْلَامِ وَمِنْ ضِیْقِ الدُّنْیَا اِلٰی سَعَۃِ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ، اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا صَاحِبَ النِّعْمَۃِ الْجَسِیْمَۃِ، اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا صَاحِبَ الْمِنَّۃِ الْعَظِیْمَۃِ، اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا اَمَنَّ خَلْقِ اللّٰہِ عَلٰی خَلْقِ اللّٰہِ، اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ وَاَنَّکَ عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ قَدْ بَلَّغْتَ الرِّسَالَۃَ وَاَدَّیْتَ الْاَمَانَۃَ، وَنَصَحْتَ الْاُمَّۃَ، وَجَاھَدْتَ فِی اللّٰہِ حَقَّ جِھَادِہٖ، وَعَبَدْتَّ اللّٰہَ حَتّٰی اَتَاکَ الْیَقِیْنُ۔ فَجَزَاکَ اللّٰہُ عَنْ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ خَیْرَ مَا جَزٰی نَبِیًّا عَنْ اُمَّتِہٖ وَرَسُوْلًا عَنْ خَلْقِہٖ۔ اَللّٰھُمَّ اٰتِ مُحَمَّدَنِ الْوَسِیْلَۃَ وَالْفَضِیْلَۃَ وَابْعَثْہُ مَقَامًا مَّحْمُوْدَنِ الَّذِیْ وَعَدْتَّہٗ اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ، اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔

آپ پر صلوٰۃ و سلام اے اللہ کے رسول، آپ پر صلوٰۃ و سلام اے اللہ کے نبی، آپ پر صلوٰۃ و سلام اے اللہ کے حبیب، آپ پر صلوٰۃ و سلام اے صاحبِ خلقِ عظیم، آپ پر صلوٰۃ و سلام اے قیامت کے دن لواء الحمد بلند کرنے والے، آپ پر صلوٰۃ و سلام اے صاحبِ مقامِ محمود، آپ پر صلوٰۃ و سلام اے اللہ کے حکم سے لوگوں کو تاریکیوں سے روشنی میں نکال کر لانے والے، آپ پر صلوٰۃ و سلام اے لوگوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی میں داخل کرنے والے، آپ پر صلوٰۃ و سلام اے لوگوں کو مذاہب کی ناانصافی سے نکال کر اسلام کے عدل و انصاف میں داخل کرنے والے اور دنیا کی تنگی سے نکال کر دنیا اور آخرت کی وسعت میں پہنچانے والے، آپ پر صلوٰۃ و سلام اے انسانیت کے سب سے بڑے محسن، اے انسانوں پر سب سے بڑھ کر شفیق، اے وہ جس کا اللہ کی مخلوق پر اللہ کے بعد سب سے بڑا احسان ہے، میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور یہ کہ آپ اللہ کے بندے اور اس کے پیغمبر ہیں، آپ نے اللہ کا

پیغام پوری طرح پہنچا دیا' امانت کا حق ادا کر دیا' اُمت کی خیر خواہی میں کسر نہیں رکھی' اللہ کے راستے میں پوری پوری کوشش کی' اور وفات تک اللہ کی عبادت میں مشغول رہے' اللہ آپ کو اس امت اور اپنی مخلوق کی طرف سے وہ بہترین جزا دے جو کسی نبی اور رسول کو اس کی امت اور اللہ کی مخلوق کی طرف سے ملی ہو' اے اللہ تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قرب و بلندی اور وہ مقامِ محمود عطا فرما' جس کا تو نے ان سے وعدہ فرمایا ہے' تو اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔ اے اللہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اور ان کی آل پر اپنی رحمتیں نازل فرما جیسی تو نے ابراہیم (علیہ السلام) اور آلِ ابراہیمؑ پر نازل فرمائیں' تو حمید و مجید ہے۔ اے اللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آلِ محمدؐ پر برکتیں نازل فرما جیسی تو نے ابراہیمؑ و آلِ ابراہیمؑ پر نازل فرمائیں' بیشک تو حمید و مجید ہے۔

اس کے بعد دونوں رفیقوں اور وزیروں کو محبت کا خراج اور عقیدت کا نذرانہ' سلام و دعا کی شکل میں ادا کیا' اور قیام گاہ پر آئے۔

اب آپ ہیں اور مسجدِ نبویؐ' دل کا کوئی ارمان باقی نہ رہ جائے۔ درود شریف پڑھنے کا اس سے بہتر زمانہ اور اس سے بہتر مقام کون سا ہو سکتا ہے۔ اب بھی شہود و حضور نہ ہو تو کب ہوگا۔ جنت کی کیاری رَوْضَةٌ مِنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ میں نمازیں پڑھیے' مگر دیکھیے کسی کو تکلیف نہ دیجیے۔ مزاحمت' جگہ کو اپنے لیے محفوظ کرنا' مسجد میں دوڑنا' سب جگہ بُرا ہے' مگر جہاں سے یہ احکام نکلے اور دنیا میں پھیلے' وہاں ان کی خلاف ورزی تو بہت ہی مکروہ ہے۔ یہاں آواز بلند نہ ہو۔ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝ یہاں دنیا کی باتیں نہ ہوں' مسجد کو گزرگاہ نہ بنایا جائے' بے وضو داخل ہونے سے حتی الامکان اِحتراز کیا جائے' خرید و فروخت سے اِجتناب کیا جائے۔

دن میں جتنے مرتبہ جی چاہے حاضری دیجیے اور سلام عرض کیجیے۔ آپ کے نصیب کھل گئے' اب کیوں کمی کیجیے' مگر ہر بار عظمت و ادب اور اشتیاق و محبت کے ساتھ۔ دل کی ایک حالت نہیں رہتی' وہ بھی سوتا اور جاگتا ہے۔ جاگے تو سمجھیے کہ نصیب جاگے' حاضری دیجیے اور عرض کیجیے۔ ؎

ز چشمم آستیں بردار و گوہر را تماشا کن

میری آنکھ سے آستین ہٹاؤ اور موتیوں کا نظارہ کرو

کبھی اس کا جی چاہے گا کہ غلاموں کے وفود کے ساتھ ملا جُلا حاضر ہو۔ عُشاق کی آنکھوں سے' جنھوں نے مجبوری کے دن کاٹے اور فراق کی راتیں بسر کیں' جب آنسوؤں کا مینھ برسے گا تو شاید کوئی چھینٹا اس کو بھی تر کر جائے' رحمت کی ہوا جب چلے گی تو شاید کوئی جھونکا اس کو بھی

لگ جائے۔ کبھی دبے پاؤں لوگوں کی نظر بچا کر تنہائی میں حاضر ہونے کا جی چاہے گا' اس باب میں دل کی فرمائش سب پوری کیجیے' کوئی حسرت باقی نہ رہے۔ کبھی صرف آنسوؤں سے زبان کا کام لیجیے' کبھی ذوق و شوق کی زبان میں عرض کیجیے۔ درود شریف طویل بھی ہیں اور مختصر بھی' جس میں جی لگے اور ذوق پیدا ہو اس کو اختیار کیجیے۔ مگر اتنا خیال رکھیے کہ توحید کی حدود سے باہر قدم نہ جائے۔ آپ اس کے سامنے کھڑے ہیں جس کو مَاشَاءَ اللّٰہُ وَشِئْتَ اور مَنْ یَّعْصِہِمَا سننا گوارا نہ ہو سکا' سجدہ کا کیا ذکر' خدا کی صفات میں' اس کی قدرت و تصرف میں' اس کی مشیت و اختیار میں شرکت کا شائبہ بھی آنے نہ پائے۔...

اب ہم مدینہ مُنوّرہ میں مقیم ہیں۔ جہاں کی خاکِ عبی کو اولیا و سلاطین سعادت سمجھتے تھے' وہاں آپ ہر وقت حاضر ہیں۔ ایک ایک دن اور ایک ایک گھڑی کو غنیمت سمجھیے۔ پانچوں نمازیں مسجد نبویؐ میں جماعت کے ساتھ پڑھیے۔ اگر کہیں باہر جایئے بھی تو ایسے وقت کہ کوئی جماعت فوت نہ ہو۔ تہجد میں حاضر ہویئے' یہ وقت سکون کا ہوتا ہے۔ لوگ روضۂ جنت کی طرف دوڑتے ہیں۔ وہاں تو بغیر دوڑے اور بغیر کشمکش جگہ پانی مشکل ہے' آپ پہلے مواجہ میں آیئے۔ اس وقت شاید آپ کو صرف پہرہ دار (عسکری) ہی ملے۔ اطمینان سے سلام عرض کیجیے۔ پھر جہاں جگہ ملے' نوافل پڑھیے' اور صبح کی نماز پڑھ کر اشراق سے فارغ ہو کر باہر آیئے۔

جنّت البقیع میں

آیئے آج بقیع چلیں جو انبیا علیہم السّلام کے مقابر کے بعد صدق و اخلاص کا سب سے بڑا مدفن ہے ؎ دفن ہو گا نہ کہیں ایسا خزانہ ہرگز۔

آپ کی سیرت نبویؐ' صحابہ کرامؓ کے احوال و مراتب پر نظر ہے تو آپ کو وہاں صحیح احساس ہو گا۔ آپ ہر قدم پر رُکیں گے اور ایک ایک خاک کے ڈھیر کو اپنے آنسوؤں سے سیراب کرنا چاہیں گے۔ یہاں چپہ چپہ پر ایمان و جہاد اور عشق و محبت کی تاریخ کندہ ہے' ایک ایک ڈھیر میں اسلام کا خزانہ دفن ہے۔... ایک لمحہ ٹھہر کر پورے بقیع پر عبرت و تفکر کی ایک نظر ڈالیے۔ اللہ اکبر' کتنے سچے تھے یہ اللّٰہ کے بندے! جو کچھ کہتے تھے کر دکھایا' رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ۔ مکّہ میں جس کے ہاتھ میں ہاتھ دیا تھا' مدینہ میں اسی کے قدموں میں پڑے ہیں۔

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم   سو اس عہد کو ہم وفا کر چلے

گنبدِ خضرا پر ایک نظر ڈالیے' پھر مدینہ کے اس شہرِ خموشاں کو دیکھیے۔ صدق و اخلاص' استقامت و وفا کی اس سے زیادہ روشن مثال کیا ملے گی۔ آیئے' بقیع میں اسلام کی خدمت کا

عہد کریں، اور اللہ سے دُعا کریں کہ وہ ہمیں اسلام ہی کے راستہ پر زندہ رکھے اور اسی کے ساتھ وفاداری میں موت آئے۔ جنت البقیع کا یہی پیغام اور یہاں کا یہی سبق ہے۔۔۔

مسجدِ قبا میں

قبا میں بھی حاضری دیجیے۔ یہ وہ بقعۂ نور ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدوم سے مدینہ سے بھی پہلے مشرف ہوا۔ وہاں اس مسجد کی بنیاد رکھی گئی جس کو **لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ** کا خطاب ملا۔ محبت و عظمت کے ساتھ حاضر ہوئیے۔ اس زمین پر نماز پڑھیے، پیشانی خاک پر رکھیے جو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور **رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا** کے قدموں سے پامال ہوئی ہے، اس فضا میں سانس لیجیے جس میں وہ اَنفاسِ قُدسیہ اب بھی بسے ہوئے ہیں۔

بر زمینے کہ نشانِ کفِ پائے تو بود   سالہا سجدۂ اربابِ نظر خواہد بود

وہ زمین جہاں آپ کے پاؤں کا نشان پڑا، وہاں اربابِ نظر سالوں تک سجدہ کرتے رہیں گے۔

جبلِ احد کے میدان میں

آج جبلِ احد اور اس کے مشہد میں (جس کو یہاں عرفِ عام میں سیّدنا حمزہ کہتے ہیں) حاضری کی باری ہے۔ دو تین میل کی مسافت کیا، بات کرتے کرتے پہنچ گئے۔ یہ وہ زمین ہے جو اسلام کے سب سے قیمتی خون سے سیراب ہوئی۔ سب سے سچے، سب سے اچھے، سب سے اونچے، عشق و محبت اور وفا کے واقعات جو دنیا کی پوری تاریخ میں نہیں ملتے، اسی زمین پر پیش آئے۔ سیّد الشہدا حمزہؓ کے رسول اللہ کی محبت اور اسلام کی وفاداری میں، یہیں اعضا کاٹے گئے اور جگر کھایا گیا، عمارۃ بن زیادؓ نے قدموں سے آنکھیں مل مل کر یہیں جان دی، انس بن النضرؓ کو جنت کی خوشبو اسی پہاڑ کے درّے سے آئی، اور اسی سے اوپر زخم کھا کر یہیں سے رخصت ہوئے، دندان مبارک یہیں شہید ہوئے، سر پر زخم یہیں آئے، عُشاق نے اپنے ہاتھوں اور پیٹھ کو محبوب کے لیے سپر یہیں بنایا، مکّہ کا ناز پروردہ مصعب بن عمیرؓ یہیں ایک کمبل میں شہید اور ایک کمبل میں دفن ہوا۔ یہاں اسلام کے شیر سوتے ہیں، یہ پوری زمین شمعِ نبوت کے پروانوں کی خاک ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے عُشاق اور اسلام کے جاں نثاروں کی بستی ہے۔

یہ بلبلوں کا صبا مشہدِ مقدّس ہے!   قدم سنبھال کے رکھیو یہ تیرا باغ نہیں!

یہاں کی فضا اور یہاں کے پہاڑ سے اب بھی **مُوْتُوْا عَلٰى مَا مَاتَ عَلَيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ** (اسی پر جان دے دو جس پر رسول اللہ دنیا سے گئے) کی صدائے بازگشت آتی ہے۔ آیئے اسلام پر جینے اور جان

دے دینے کا عہد پھر تازہ کریں۔

مدینہ کی سوغات

مدینہ طیبہ کے ذرّہ ذرّہ کو محبت و عقیدت کی نگاہ سے دیکھیے' تنقید کی نگاہ اور اعتراض کی زبان کے لیے دنیا پڑی ہوئی ہے۔ زندگی کے چند دن کانٹوں سے الگ پھولوں میں گزر جائیں تو کیا حرج ہے۔ . . .

مدینہ دعوتِ اسلامی کا معدن ہے۔ اس دعوتِ دین کو اس معدن سے اخذ کیجیے' اور اپنے اپنے ملک کے لیے یہ سوغات لیکر آیئے۔ کھجوریں' گلاب و پودینہ' خاک شفا' محبت کی نگاہ میں سب کچھ ہیں' مگر اس سرزمین کا اصلی تحفہ اور یہاں کی سب سے بڑی سوغات' دعوت اور اسلام کے لیے جدوجہد اور جان دے دینے کا عزم ہے۔ مدینہ' مسجد نبویؐ کے چپّہ چپّہ' بقیع شریف کے ذرّہ ذرّہ' اُحد کی ہر ہر کنکری سے' یہی پیغام دیتا ہے۔ مدینہ آکر کوئی یہ کیسے بھول سکتا ہے کہ اس شہر کی بنیاد ہی دعوت و جہاد پر پڑی تھی۔ یہاں وہی لوگ مکّہ سے آکر آباد ہوئے تھے جن کے لیے مکّہ میں سب کچھ تھا مگر دعوت و جہاد کے مواقع نہ تھے۔ یہاں کی آبادی دو ہی حصوں پر منقسم تھی ایک وہ جس نے اپنا عہد پورا کردیا اور اسلام کے راستہ میں جان' جاں آفرین کے سپرد کردی' کوئی خوف کوئی ترغیب اس کو اپنے مقصد سے باز نہ رکھ سکی۔ دوسرا وہ جس نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی' لیکن اللہ کو ابھی ان سے اور کام لینا منظور تھا۔ ان کا جو وقت گزرتا حالت انتظار میں گزرتا' شہادت کے اشتیاق میں گزرتا' مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۝ (الاحزاب ۳۳:۲۳)

یہی عالمِ اسلام کا حال ہونا چاہیے۔ یہاں بھی یا تو وہ ہونے چاہئیں جو اپنا کام پورا کرچکے' یا وہ جو وقت کے منتظر ہیں۔ تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جو زندگی کے حریص اور دنیا پر راضی' موت سے خائف اور خدمت سے گریزاں ہوں' معاش میں سرتاپا منہمک اور عارضی مشاغل میں ہمہ تن غرق ہوں' ان کی گنجائش نہ مدینہ میں تھی نہ عالمِ اسلام میں ہونی چاہیے۔

مدینہ طیبہ کے قیام میں درود شریف' تلاوتِ قرآن اور اذکار سے جو وقت بچے اگر حدیث اور سیرت و شمائل کے مطالعہ میں گزرے تو بہت پُرتاثیر اور بابرکت ہوگا' اسی پاک زمین پر یہ سب واقعات پیش آئے۔ یہاں ان واقعات کا مطالعہ اور کتبِ شمائل میں مشغولیت بہت کیف آور اور موجبِ ترقی ہوگی۔ . . .

الوداع، مدینہ

لیجیے قیام کی مدت ختم ہونے کو آئی، کل کہتے ہیں کہ قافلہ کا کوچ ہے۔

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

افسوس کہ دوست کی صحبت چشم زدن میں ختم ہو گئی، ابھی پھولوں کو اچھی طرح دیکھا بھی نہ تھا کہ موسم بہار ختم ہو گیا۔

اب رہ رہ کر اس قیام کے سلسلہ کی کوتاہیاں اور یہاں کے حقوق کی ادائی میں اپنی تقصیر دل میں چٹکیاں لیتی ہے، اب استغفار و ندامت کے سوا کیا چارہ ہے۔

آج کی رات مدینہ کی آخری رات ہے، ذرا سویرے سے مسجد میں آ جایئے۔

تَمَتَّعْ مِنْ شَمِیْمِ عَرَارِ نَجْدٍ فَمَا بَعْدَ العَشِیَّۃِ مِنْ عَرَارِ

عرار نجد کی خوشبو سے خوب فیض یاب ہو جاؤ کہ اس رات کے بعد دوبارہ کوئی عرار نہ ہوگی۔

لیکن دل کو ایک طرح کا سکون بھی حاصل ہے۔ آخر جا کہاں رہے ہیں؟ اللہ کے رسولؐ کے شہر سے اللہ کے شہر کی طرف، اللہ کے اس گھر سے جس کو محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام اور ان کے ساتھیوں نے اپنے پاک ہاتھوں سے بنایا، اللہ کے اس گھر کی طرف جس کو ان کے جدّ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور ان کے فرزند نے اپنے پاک ہاتھوں سے بنایا۔ اور جا کیوں رہے ہیں؟ اللہ کے حکم سے اور اللہ کے رسولؐ کی مرضی اور ہدایت سے، یہ دُوری دُوری کب ہوئی۔

نہ دوری دلیلِ صبوری بود کہ بسیار دُوری، ضروری بود

دُوری، صبر کی دلیل نہیں ہوا کرتی، بارہا ایسا ہوتا ہے کہ دُوری، ضروری ہو جاتی ہے۔

آخری سلام عرض کیا، مسجدِ نبویؐ پر حسرت کی نگاہ ڈالی، اور باہر نکلے... موٹر پر بیٹھے، محبوب شہر پر محبت کی نگاہ ڈالتے چلے... جو لمحہ گزرتا ہے، مدینہ دُور اور مکہ قریب ہوتا جاتا ہے۔ الحمد للہ کہ ہم حرمین کے درمیان ہی ہیں۔ ؎

صد شکر کہ ہستیم میانِ دو کریم

اللہ کا شکر ہے کہ ہم دو کریم ہستیوں کے درمیان ہیں۔

مکہ معظمہ میں

اب شہنشاہِ ذُوالجلال کا شہر اور اس کا گھر قریب ہے، باادب و ہوشیار! مدینہ اگر مرکزِ جمال تھا تو یہ مرکزِ جلال ہے، مدینہ کے درودیوار سے اگر محبوبیت ٹپکتی ہے تو یہاں کے درودیوار سے عاشقی نمایاں ہے۔ یہاں عاشقانہ آنے کی ضرورت ہے، برہنہ سر، کفن بردوش، پریشاں بال، یہی یہاں کے

آداب میں سے ہے۔

نظر اٹھائیے مکہ سامنے نظر آرہا ہے۔

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ لِّیْ بِهَا قَرَارًا وَّارْزُقْنِیْ فِیْهَا رِزْقًا حَلَالًا ۔

اے اللہ مجھے اپنے شہر میں ٹھکانا عطا فرما' اور مجھے اس میں رزق حلال نصیب فرما۔

لیجیے' اب ہم اللہ کے شہر بَلَدُ اللّٰہِ الْحَرَام' اَلْبَلَدُ الْاَمِیْن میں داخل ہوگئے۔ جس شہر کا نام تسبیح کی طرح بچپن سے ہر مسلمان کی زبان پر جاری رہتا ہے' جس کا اشتیاق جنت کی طرح ہر مومن کے دل میں رہتا ہے' جو ہر مسلمان کا ایمانی اور دینی وطن ہے' جس کی کشش ہر زمانے میں ہزاروں میل کی مسافت' پہاڑوں کی چوٹیوں اور وادیوں کی گہرائیوں سے مشتاقانِ زیارت کو کھینچتی رہی۔

لیجیے' مسجدِ حرام پر پہنچ گئے' باب السلام سے داخل ہوئے' یہ سیاہ غلاف میں ملبوس مسجدِ حرام کے بیچوں بیچ بیت اللہ نظر آرہا ہے۔

اَللّٰهُمَّ زِدْ هٰذَا الْبَیْتَ تَشْرِیْفًا وَّ تَعْظِیْمًا وَّتَکْرِیْمًا وَّمَهَابَةً وَّ زِدْ مَنْ شَرَّفَهٗ وَکَرَّمَهٗ مِمَّنْ حَجَّهٗ اَوِاعْتَمَرَهٗ تَشْرِیْفًا وَّ تَکْرِیْمًا وَّتَعْظِیْمًا وَّ بِرًّا اَللّٰهُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْکَ السَّلَامُ فَحَیِّنَا رَبَّنَا بِالسَّلَامِ ۔

اے اللہ اس گھر کی عزت و عظمت' شرافت و ہیبت میں ترقی فرما' اور حج و عمرہ کرنے والوں میں بھی جو اس کی تعظیم و تکریم کرے اس کو بھی شرافت و عظمت اور نیکی عطا فرما' اے اللہ تیرا ہی نام سلام ہے اور سلامتی تیری ہی طرف سے ہے' ہم پر سلامتی بھیج۔

یہی بیت اللہ ہے جس کی طرف ہزاروں میل کے فاصلہ سے ساری عمر نمازیں پڑھتے رہے' جس کی طرف نماز میں منہ کرنا فرض تھا۔ یہ آج ہماری نگاہوں کے سامنے ہے' ہمارے اور اس کے درمیان چند گز سے زیادہ فاصلہ نہیں' ہم اپنے گنہگار ہاتھوں سے اس کے غلاف کو چھو سکتے ہیں' اس کو آنکھوں سے لگا سکتے ہیں' اس کی دیواروں سے چمٹ سکتے ہیں۔ عمر میں بڑی بڑی حسین و جمیل عمارتیں اور فنِ تعمیر کے بڑے بڑے نمونے دیکھے' لیکن اس سادہ سے چوکور گھر میں خدا جانے کیا حُسن و جمال اور کیا دلکشی و محبوبیت ہے کہ آنکھوں میں کھُبا جاتا ہے اور دل میں سمایا جاتا ہے' کسی طرح نظر ہی نہیں بھرتی۔ تجلیاتِ الٰہی اور انوار کا ادراک تو اہلِ نظر کر سکتے ہیں' لیکن جلال و جمال کا ایک پیکر ہم جیسے بے حِسوں اور کم نظروں کو بھی نظر آتا ہے' اور یہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ اس کے دیکھنے سے آنکھوں کو سیری اور دل کو آسودگی نہیں ہوتی' جی چاہتا ہے

کہ دیکھتے ہی رہیے۔ اس کی مرکزیت و موزونیت' اس کی زیبائی و رعنائی' جلال و جمال کی آمیزش الفاظ سے بالاتر ہے۔

مُحَاسِنُہٗ ھُیُولٰی کُلِّ حُسْنٍ وَمَغْنَاطِیْسُ اَفْئِدَۃِ الرِّجَالِ

اس کی خوبیاں ہر خوبصورتی کا عکس ہیں' یہ مقناطیس کی طرح لوگوں کے دلوں کو کھینچتا ہے۔

اس کا دیکھتے رہنا دل کا سرور' آنکھوں کا نُور' رُوح کی غذا اور نظر کی عبادت ہے' دل کی کلفت اس سے کافور' دماغ کا تکان اس سے دُور ہوتا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے عجیب نعمت عطا فرمائی ہے۔ سارے عالم کی دلکشی اور دل آویزی اس میں سمٹ کر آگئی ہے۔

بیت اللہ کے گرد طواف کرنے والوں کا چکر چل رہا ہے' سیاہ غلاف کے چاروں طرف سفید احرام میں ملبوس انسانوں کی گردش' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیاہ کعبہ کے گرد دودھ کی ایک نہر بہہ رہی ہے۔ ہم بھی آدمیوں کے اس بہتے ہوئے دریا میں داخل ہوئے۔ . .

ملتزم پر

ملتزم پر آئے۔ یہ حجرِ اسود اور بابِ کعبہ کے درمیان کا حصہ ہے۔ یہاں اللہ کے بندے' بیت اللہ کی دیوار اور اس کے غلاف سے چمٹے ہوئے' اس طرح بلک بلک کر رو رہے تھے' اور اللہ کے گھر کا واسطہ دے کر اس کی چوکھٹ سے لپٹ کر اللہ سے مانگ رہے تھے' جس طرح ستائے ہوئے بچے اپنی ماں سے چمٹ کر روتے اور بلبلاتے ہیں۔ جس وقت وہ 'یا ربَّ البیت' 'یا ربَّ البیت' اے گھر والے' اے گھر کے مالک' کہتے' ایک کہرام مچ جاتا' سخت سے سخت دل بھی بھر آتا' آنکھیں اشکبار ہو جاتیں' اور دعاؤں کی قبولیت کا ایک اطمینان سا ہونے لگتا۔ خدا کی طرف رجوع و انابت کا یہ ایک ایسا منظر تھا کہ دنیا کی کوئی قوم اس کی نظیر نہیں پیش کرسکتی۔ اس سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ اس امت کو اس گئی گزری حالت میں بھی اپنے مالک سے جو تعلق ہے اس کا عشرِ عشیر بھی کہیں نظر نہیں آتا۔ معلوم ہوتا تھا کہ دل سینہ سے نکل جائیں گے' قلب و جگر آنسو بن کر بہہ جائیں گے' لوگ غش کھا کھا کر گر جائیں گے۔

ان دعاؤں میں بڑا حصہ مغفرت و عفو' رضا الٰہی' حسنِ خاتمہ اور جنت کی دعاؤں کا تھا۔ اللہ سے کسی مادی سے مادی چیز کا مانگنا بھی مادیت نہیں' سراسر روحانیت و عبادت ہے۔ لیکن ان دعاؤں میں آخرت اور روحانیت کا حصہ اس عالمِ مادی کی چیزوں سے بہرحال زیادہ تھا۔ افکار و پریشانیوں کے اس دَور میں' اللہ کے بہت سے بندے صرف اللہ کی محبت' توفیقِ اطاعت' شانِ عبودیت' اخلاص' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت' عشقِ کامل' اتباعِ سنت' دین کی خدمت

اور اسلام پر جینے اور مرنے کی دعا کر رہے تھے۔ بہت سے اللہ کے بندے اپنی دنیاوی ضروریات کو بے تکلف مانگ رہے تھے کہ وہ کریم ہے' اس کے دروازہ اور اس کے آستانہ پر نہ مانگی جائیں گی تو کس سے اور کہاں مانگی جائیں گی۔ بہت سے اللہ کے بندے کعبہ کے پردہ میں منہ ڈالے ہوئے گریہ و بکا اور مناجات و دعا میں مشغول تھے۔ غرض یہاں سائلوں کا ہجوم اور فقرا کا جمگھٹا تھا' رَبِّ کریم کا دروازہ کھلا تھا' اور بے صبرو مضطر سائل سوال و طلب میں بالکل کھوئے ہوئے تھے۔

صفا اور مروہ کے درمیان

ہر ایک احرام میں ملبوس' ننگے سر' ننگے پاؤں' عاشقانہ حال' مستانہ چال' دنیا سے بے خبر' اپنی دھن میں مست ' رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ اِنَّکَ اَنْتَ الْاَعَزُّ الْاَکْرَمُ کی صداؤں سے فضا گونجتی ہوئی' دونوں طرف پُر رونق دکانیں' مسعیٰ کا بازار اپنے پورے شباب اور بہار پر' موٹریں اور کاریں ہارن بجاتی ہوئی اور آدمیوں کو بچاتی ہوئی نکلتی رہتی ہیں۔ دکانوں پر سودے بِک رہے ہیں' شربت کے گلاس کے دَور چل رہے ہیں' صرافوں کی دکانوں پر روپیہ گننے اور سکّوں کے گرنے کی آواز کانوں میں آرہی ہے' لیکن عُشّاق کا مجمع سر جھکائے نظر بچائے' اپنی دُھن میں چلا جارہا ہے۔ عشق کی پوری تصویر' دنیا میں مومن کے رہنے کی مکمل تفسیر' خلوت در انجمن کا پورا منظر' دنیا کے بازار میں چلتی پھرتی مسجدیں اور گونجتی ہوئی اذانیں۔ سعی کیا ہے' مومن کی پوری زندگی! بھرے بازار' پھولوں سے لدے گلزار میں رہنا اور دل نہ لگانا' مقصد کو پیش نظر رکھنا' مبدا و منتہیٰ کو نہ بھولنا' اپنے کام سے کام رکھنا' صَفا سے چل کر نہ مَروہ کو فراموش کرنا نہ مَروہ سے چل کر صَفا کو بھول جانا' کہیں نہ اٹکنا کہیں نہ الجھنا' پیہم گردش' مسلسل عمل' مسعیٰ میں دونوں طرف دکانوں کے ہونے نے اور سعی کے اس محلِ وقوع نے سعی میں ایک خاص معنویت اور لطف پیدا کردیا ہے۔

پ کو اس راستہ پر عالم اسلام کے گوشہ گوشہ اور چپّہ چپّہ کے مسلمان ایک لباس میں ملبوس' ایک ترانہ بلند کرتے ہوئے' ایک عشق و سرمستی کی کیفیت میں آتے جاتے نظر آئیں گے' تیز قدم بڑھاتے ہوئے' ننگا سر' اللہ کے سامنے جھکائے ہوئے چلے جارہے ہیں' ان میں امیر بھی ہیں غریب بھی' سرخ سفید شامی و مغربی بھی اور سیاہ فام حبشی و تکرونی بھی' مرد بھی اور عورت بھی' لیکن کسی کو کسی کے دیکھنے اور توجہ کرنے کی فرصت نہیں' بعض اوقات اس مجمع عُشّاق کو دیکھ کر قلب پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوتی ہے اور بے اختیار اِن عُشّاق کے پاؤں پڑنے اور ان کی بلائیں لینے کو جی چاہتا ہے' اسلام کی محبت جوش مارتی ہے' وطن و قوم کی حد بندیاں ٹوٹنے لگتی ہیں' اپنی وحدت کا احساس ابھرنے لگتا ہے۔ . . .

مکہ کے شب و روز

اب روزانہ کا معمول یہ ہے کہ صبح صادق سے پہلے حرم میں آگئے' کبھی رکنِ یمانی کے سامنے مصلیٰ مالکی کے پاس' کبھی حطیم کے سامنے مصلیٰ حنفی کے نزدیک' کبھی مصلیٰ حنبلی سے ملے ہوئے' اور کبھی قسمت سے مقامِ ابراہیم کے پاس یا مصلیٰ شافعی کے دائیں بائیں' نوافل پڑھے۔ کبھی ہر دو رکعت کے بعد ایک طواف کیا' کبھی نوافل کے بعد اکٹھا کئی طواف کر لیے۔ غرض جس طرح موقع ملا نوافل و طواف میں وقت گزارا' صبح کی اذان ہوئی' نماز پڑھی۔ اس وقت طواف کرنے والوں کا ہجوم ہوتا ہے' خدا جانے کتنے اولیا اللہ اور مقبولینِ بارگاہ ہوتے ہیں' عامۃ مومنین بھی کیا کم ہیں۔ طلوعِ آفتاب تک طواف کیے' پھر اکٹھا طواف کی رکعتیں پڑھیں' اشراق پڑھی اور قیام گاہ پر آگئے۔

مکہ معظمہ میں طواف سے بہتر مشغلہ اور وظیفہ کیا' سارے دن آدمی طواف کر سکتا ہے۔ بعض اہلِ ہمت بیس بیس' تیس تیس طواف دن بھر میں کر لیتے ہیں۔ . . . آخر شب میں اور گرمیوں میں ٹھیک دوپہر کو مجمع کم ہوتا ہے۔ بعض اہلِ ذوق ان اوقات کا انتظار کرتے ہیں' بعض ہر نماز کے بعد کرتے ہیں' بعض مجمع ہی کو پسند کرتے ہیں کہ معلوم نہیں کس کی برکت سے ہمارا طواف اور ہماری دعائیں بھی قبول ہو جائیں' رحمتِ الٰہی کسی کی طرف متوجہ ہو اور ہم کو بھی نہال کر جائے۔

وَلِلنَّاسِ فِي مَا يَعْشَقُونَ مَذَاهِبُ

لوگوں نے عشق کے اپنے اپنے طریقے اپنا رکھے ہیں۔

لیکن کسی وقت آیئے' دن ہو یا رات' پچھلا پہر ہو یا ٹھیک دوپہر' شمع پر پروانوں کا وہی ہجوم ہے' مطاف کسی وقت خالی نہیں۔ اگر اس کے انتظار میں رہیے گا کہ دو چار آدمی ہوں اور پورے سکون و طمانیت کے ساتھ طواف کریں' تو یہ حسرت کبھی پوری نہ ہوگی جس کو اللہ تعالیٰ نے مثابۃ للناس (لوگوں کے لوٹ لوٹ کر آنے کی جگہ) بنایا' اور جس کو سب سے بڑی محبوبیت و مرکزیت عطا فرمائی اور دل کشی کوٹ کوٹ کر بھر دی' وہ عشاق سے خالی کب رہ سکتا ہے' رات کو عشا کے بعد سے صبح صادق تک ہر ہر گھڑی میں آکر دیکھا دربار بھرا ہی ہوا پایا۔

ادھر ملتزم کا حال یہ ہے کہ وہ دعا کرنے والوں اور مچل مچل کر مانگنے والوں اور لپٹ لپٹ کر فریاد کرنے والوں سے کسی وقت خالی نہیں۔ کوئی عربی میں' کوئی فارسی میں' کوئی ترکی میں' کوئی سوڈانی میں' کوئی جاوی میں' کوئی اردو میں' کوئی بنگالی میں' کوئی نثر میں' کوئی نظم میں' کوئی زبان بے

زبانی میں عرضِ حال کر رہا ہے' دل کھول کھول کر مانگ رہا ہے' پھوٹ پھوٹ کر رو رہا ہے۔ کوئی پردہ میں منہ ڈالے بڑے درد سے پڑھ رہا ہے۔

بردر آمد بندۂ بگریختہ آبروئے خود بہ عصیاں ریختہ

تیرے در پر تیرا بندہ روتا ہوا آیا ہے اور ایسی حالت میں کہ عزت و آبرو بھی گناہوں سے آلودہ ہے۔

یا رَبَّ الْبیت' یا رَبَّ الْبیت کی صدا بلند ہے۔ . . .

منیٰ میں

منیٰ کا عجیب منظر تھا' سارا شہر بقعۂ انوار بنا ہوا تھا' عالم اسلام کچھ سوتا تھا کچھ جاگتا تھا' ہر طرف تجلیات و انوار کا ہجوم معلوم ہوتا تھا' اپنی جگہ پر رہا نہ گیا' مسجد خیف کی طرف چلے' حضرت ابراہیمؑ کی قربانی اور حضرت اسماعیلؑ کے صبرواستقامت کی یاد بڑی شدت سے پیدا ہوئی۔ خداوندا! عشقِ ابراہیمؑ کا ایک ذرّہ عطا ہو' الٰہی مُردہ دل کو اپنے عشق و محبت سے زندہ کردے' محبت کا سوز عطا ہو جو ماسوئی کو جلا دے۔ عالم اسلام اس وقت ابراہیمؑ کی آواز پر جمع ہے' اس میں محبت کی حرارت پیدا کردے کہ پھر زندہ ہو جائے' پھر تیرے لیے اپنی جان و مال کی قربانی کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ عجب سرور و حضور کا عالم تھا' عجب ذوق و شوق کا وقت تھا۔ . . .

عرفات میں

لیجیے عرفات آگیا۔ اللہ غنی' انسانوں کا ایک جنگل' جنگل میں منگل' کئی لاکھ انسان' دو بے سلی چادروں میں' شاہ و گدا ایک لباس میں' جہاں تک نظر کام کرتی ہے' خیمے اور شامیانے ہی نظر آتے ہیں' جو نظر آتا ہے دو سفید چادروں میں' معلوم ہوتا ہے آج فرشتوں نے اللہ کی یہ زمین بسائی ہے۔ سفید براق لباس' نورانی صورتیں' ذکر سے تر زبانیں' لبیک لبیک کی صدا گونجتی ہوئی اور پہاڑوں سے ٹکراتی ہوئی۔ انسانوں کا اتنا بڑا مجمع' لیکن نہ چپقلش نہ کشاکش' روحانیت و انابت کی فضا چھائی ہوئی۔ . . .

الحج عرفہ' حج عرفہ کا نام ہے' عرفہ حج کا نچوڑ ہے' یہی حج کی قبولیت کے فیصلہ کا دن ہے' یہی دعاؤں کے مقبول ہونے کا وقت ہے' یہی دل کھول کر مانگنے کی جگہ اور زمانہ ہے۔ اللہ کے بندے ذکرودعا میں مشغول ہوگئے۔ جن تمناؤں کو چھپا چھپا کر رکھا تھا آج ان کو کھول کر پیش کردیا' جن کو پہلے سے دعا کا سلیقہ تھا آج وہ کام آیا۔ ذکر و سلوک' صحبت' سب قوت دعا اور توجہ الی اللہ کو بڑھانے ہی کے لیے ہیں۔ . . .

۔۔۔

جبلِ رحمت پر سائلوں کا ہجوم ہے' گویا بڑے پیمانے پر مُلتزم کا نقشہ ہے۔ سوال و دعا کا غُلغلہ بلند ہے' بھرائی ہوئی آوازیں اور گلوگیر صدائیں' بیچ بیچ میں بے حس و سخت دل لوگوں کے دل میں بھی رقت اور گداز پیدا کرتی ہیں۔ سب اپنی اپنی دلی مراد مانگ رہے ہیں۔ . . .

رمی جمار

حضرت ابراہیمؑ نے ہر عمل پیغمبرانہ اخلاص اور عاشقانہ کیفیت کے ساتھ کیا تھا' . . . اس لیے اللہ نے ان کے ہر فعل کو زندگیٔ جاوداں بخشی اور اس کی یادگار باقی رکھی۔ آج ان افعال کی نقل میں بھی عشق کی کیفیت اور زندگی و تازگی ہے' بشرطیکہ دل محبت و عظمت اور ایمانی کیفیات سے بالکل خالی نہ ہو۔ حج کی ہر چیز میں عاشقانہ کیفیت اور محبوبانہ ادا ہے۔ سعی و طواف تو عشق و جذب کی کھلی نشانیاں ہیں' مگر یہ رمی (کنکری مارنا بھی) عجب پیاری ادا ہے۔ عاشقیت و محبوبیت توام ہیں' سچے عشق کے ساتھ جو چیز کی جائے گی اس پر اہلِ دل کو پیار ہی آئے گا۔ رمی کرتے وقت اگر دل میں سیدنا ابراہیمؑ کی محبت' اللہ تبارک و تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کا جذبہ اور اپنے دشمن حقیقی سے نفرت کا جوش' ہو تو رمی عجب بہار کی چیز ہے' عجب عبادت ہے۔ اور اگر یہ کیفیات اتفاقاً" نہ ہوں' یا ان کا اِستحضار نہ ہو' تو بھی حکمِ الٰہی کی اطاعت کسی حال میں فائدہ سے خالی نہیں۔ . . .

قیامِ منیٰ

اب یہاں کی ہر رات اور ہر دن حاصلِ عمر ہے' خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو ایک ایک گھڑی غنیمت سمجھیں اور غفلت کا کوئی لمحہ گزرنے نہ دیں۔ یہی دن ہیں جن کے متعلق قرآن مجید میں صراحۃ" حکم ہے۔

فَإِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا (البقرہ ۲:۲۰۰)

پھر جب پورے کر چکو اپنے حج کے کام تو یاد کرو اللہ کو جیسے یاد کرتے تھے اپنے باپ دادوں کو بلکہ اس سے زیادہ یاد۔

اس لیے یادِ الٰہی میں جتنا انہماک اور عبادت میں جتنی مشغولیت ہو کم ہے' مگر افسوس کہ اس کا حق بالکل ادا نہ ہو سکا اور اس میں شدید کوتاہی رہی' بے تکلف دوستوں کا مجمع' کھانے پینے کی بہتات' عمر بھر کی غفلت کی عادت' بڑا وقت ہنسنے بولنے اور کھانے پینے میں گزر جاتا' ناظرین کرام سے کہنے کا جی چاہتا ہے' کہ ع

من نکردم شما حذر بکنید

میں نے پرہیز نہ کیا مگر آپ تو کریں۔

ان دنوں میں بہ شدت اس کا احساس ہوتا ہے کہ منیٰ کے کم سے کم یہ تین دن دینی دعوت اور تعلیم و تربیت کے مُغتنَم ترین دن ہیں جو مجموعی طور پر عالم اسلام کو اتنے بڑے پیمانے پر کبھی میسر نہیں آسکتے۔ عالم اسلام کا ایک بہترین نمائندہ مجمع جو راہ خدا میں نکلا ہوا ہوتا ہے جس میں اتنے دنوں کے مجاہدہ، تعلقات و مشاغل سے انقطاع، فاسد ماحول سے بے تعلق، حج کے انوار و تاثیرات کی وجہ سے دین کے جذب و قبول کرنے کی استعداد پیدا ہو چکی ہوتی ہے اور دین و عبادت ہی کے لیے اس کا قیام ہوتا ہے، اگر اس وقت سے فائدہ اٹھایا جائے تو برسوں کا کام چند دنوں میں، اور ہزاروں میل کا سفر ایک مختصر سے رقبہ میں طے ہو جائے...

مگر صد حیف کہ ایسی فرصت سے دینی تعلیم و تربیت اور اسلامی دعوت کا فائدہ قطعاً نہیں اٹھایا جاتا۔ ہماری دینی زندگی کی چول اپنی جگہ سے ایسی ہٹی ہوئی ہے کہ کسی چیز سے بھی ہم فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ صرف منیٰ کے قیام کے یہ دن اور حجاج کا یہ مجمع ایسا تھا کہ اس سے پورے عالم اسلام میں دین کی روح پھونکی جاسکتی تھی اور دعوت کا جذبہ پیدا کیا جاسکتا تھا۔ ایک باد بہاری تھا جو سارے عالم میں دینی دعوت و اصلاح کے بیج بکھیر سکتا تھا اور دین کے ہزاروں چمن کھلا سکتا تھا۔۔

پہلے یہ سب حج کے ثمرات و منافع میں داخل تھا۔ لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ کا مفہوم اتنا تنگ نہیں جتنا سمجھا جاتا ہے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے امت کو جو آخری عالمگیر وصیت فرمائی ہے وہ عرفات و منیٰ کے میدان ہی میں فرمائی۔ عرفات و منیٰ کا مخاطب مجمع ہی اس کی صلاحیت رکھتا تھا کہ فرمایا جاتا:

لِيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الغَائِبَ فَرُبَّ مُبَلَّغٍ أَوْعَى مِنْ سَامِعٍ۔

دیکھو جو موجود ہے وہ میری یہ باتیں ان تک پہنچا دے جو یہاں موجود نہیں، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جو بالواسطہ سنتا ہے وہ اپنے کانوں سے سننے والے سے زیادہ سمجھنے والا اور یاد رکھنے والا ہوتا ہے۔

حج ہی کے موقع پر سورۂ براءت کی ابتدائی آیات اور مشرکین کے احکام کا اعلان ہوا، حج ہی کے موقع پر ایک خلقت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست دین کی تعلیم حاصل کی، حج ہی کے موقع پر بلاد و امصار کے طالب علم دین سیکھنے، احکام معلوم کرنے، حدیث سننے جمع ہوا

کرتے تھے۔ حج آج بھی عالمِ اسلام میں زندگی کی لہر پیدا کر سکتا ہے' مسلمانوں میں دینی شعور اور اپنی ذمہ داری کا احساس پیدا کرا سکتا ہے۔ حج ہی کے ذریعہ اس بھٹکے ہوئے قافلہ کو اپنی گم کردہ منزل نظر آ سکتی ہے' اور معمارِ حرم کو "تعمیرِ جہاں" کا بھولا ہوا کام یاد آ سکتا ہے۔ حج اصلاح و انقلاب کی ایک عظیم الشان طاقت ہے' مگر ہماری کاہلی اور نادانی سے یہ طاقت بہت کچھ ضائع ہو رہی ہے' ہر سال ضائع ہوتی ہے' اور برس ہا برس سے ضائع ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعامات میں کمی نہیں مگر ہماری طرف سے ناقدری میں بھی کمی نہیں۔ اگر کسی زندہ اور صاحبِ عمل قوم کو یہ موقع حاصل ہوتا اور اس کو ہر سال بلا کسی جدوجہد اور مادی ترغیب کے محض دینی کشش اور اُخروی نفع کی بنا پر یہ عالمگیر اجتماع میسر ہوتا' تو وہ تمام عالَم میں انقلاب برپا کر سکتی تھی اور دنیا کے گوشہ گوشہ میں اپنا پیغام پہنچا سکتی تھی۔ دنیا کی بہت سی قومیں جو نبوت اور وحی الٰہی کی عطا کی ہوئی دولتوں سے محروم ہیں'۔۔۔ ان کو اپنی چھوٹی چھوٹی مجلسوں کے لیے لاکھوں روپیہ خرچ کرنے پڑتے ہیں' طاقت ور پراپیگنڈا کرنا پڑتا ہے' پھر بھی کامیابی نہیں ہوتی' اس لیے کہ ان کے ساتھ دینی کشش اور روحانی جذب نہیں۔ لیکن مسلمانوں کو اس مفت کی دولت کی قدر نہیں۔

الوداع' مکّہ

مکّہ معظمہ میں داخل ہو گئے حرم میں نماز پڑھیے اور طواف کیجیے' بیت اللہ کو دیکھیے اور دیکھتے رہیے' ہر وقت اس کا نیا جمال' اور نئی شان ہے۔

کعبہ را ہر دم تجلی می فزود این ز اخلاصاتِ ابراہیم بود

کعبہ کی تجلی ہر دم بڑھتی رہتی ہے' یہ حضرت ابراہیم کے اخلاص میں ہے

اتنے دن سے اس کو دیکھ رہے ہیں مگر جی نہیں بھرتا' نگاہ نہیں تھکتی' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود اس ذاتِ عالی کے جمالِ جہاں آرا کا کیا حال اور اس دید کی کیا مسرت و لذت ہوگی۔

(تلخیص و تدوین: خ - م)

اللہ کی نعمتیں

یہ ٹھنڈا سایہ ! یہ ٹھنڈا پانی ! یہ ٹھنڈی کھجوریں !

حضورؐ نے فرمایا:

اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے ، یہ اُن نعمتوں میں سے ہیں جن کے بارے میں تمہیں قیامت کے روز جواب دہی کرنی ہوگی : یہ ٹھنڈا سایہ ! یہ ٹھنڈی کھجوریں ! یہ ٹھنڈا پانی !

(مسلم ، ابن ماجہ ، ابو داؤد ، ترمذی ، نسائی ، احمد)

میرے اللہ ! میری خطاؤں کو برف اور اولوں کے (صاف و ٹھنڈے) پانی سے دھو ڈال اور میرے دل کو خطاؤں سے اس طرح پاک و صاف کر دے جس طرح سفید کپڑے کو میل کچیل سے ۔

اللہ کی نعمتیں آپ کیلئے ہیں، اِس کے شکر سے غافل نہ ہوں

اللہ کے گھر پہنچ کر

سیّد مناظر احسن گیلانیؒ

بیت اللہ کے جوار میں

طواف و سعی سے فارغ ہونے کے بعد جب رباط پہنچا' اور قیام و طعام کے نظم کا سوال اٹھا' تو خاکسار نے رفیقوں سے عرض کیا کہ نامناسب نہ سمجھا جائے تو اس بندے کو پروانۂ آزادی عطا فرما دیا جائے۔ پوچھا گیا' تیرا مطلب کیا ہے ؟ عرض کیا گیا کہ میرے لیے نہ قیام ہی کی فکر کیجیے نہ طعام کی۔ دِل یہ چاہتا ہے کہ چند دن کے لیے میر مرحوم کے شعر کی لذت حاصل کروں۔ یعنی ؎

ہو گا کسی دیوار کے سایے تلے میر   کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

میری آرام طلبی نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ صرف شطرنجی اور تکیہ لے کر یہ دو تین دن جو آغاز مناسک کے لیے باقی ہیں ان کو حرم ہی کے کسی گوشہ میں گزار دوں۔ یہ تجویز دماغ میں مختلف وجوہ سے آئی۔ زمانہ وہ آ گیا تھا کہ چاروں طرف سے حجاج کھنچ کھنچا کر مکّہ مُعظمہ میں جمع ہو چکے تھے۔ لاکھوں لاکھ کی اس بھیڑ میں سب سے بڑی محرومی اپنی یہ محسوس ہوتی تھی کہ براہِ راست حجرِ اسود کی تَقبِیلُ و لَمس (یعنی بوسہ دینے) کی آرزو دل ہی دل میں رہی جاتی تھی۔

خیال آتا تھا کہ از آدمؑ تا خاتمؐ ' حضرات انبیا علیہم السلام کے دستِ مبارک کی قائم مقامی جو پتھر کر رہا ہے' ان بزرگوں کی تَقبِیلُ و لَمس سے خانہ کعبہ کا یہ پتھر مشرّف ہے۔ اس کو چومنا' اور اس پر ہاتھ رکھ کر کلمۂ شہادت و دعوت کے عہد و میثاق کی تجدید کی تمنا دل کو تڑپا رہی تھی۔ یَدُ اللّٰہِ فَوقَ اَیدِیھِم کا قرآنی اشارہ حوصلہ میں اَور بلندی پیدا کرتا تھا۔ صحیح حدیثوں میں پڑھا تھا کہ کعبہ کی دیوار کا یہ پتھر' آسمان و زمین کے خالق و مالک کا یمین اور سیدھا ہاتھ ہے۔ اللہ اللہ ! اللہ کا داہنا ہاتھ بڑھا ہوا تھا' وہی ہاتھ جو اوّل سے آخر تک سارے انبیا کے مبارک و مقدّس

ہاتھوں پر تھا۔ جی چاہتا تھا کہ اسی کے ساتھ لپٹ جاؤں، پکڑ لوں اُس ہاتھ کو، کہ پھر وہ ہاتھ سے نہ چھوٹے۔

لیکن انسانوں کا طوفان تھا جو اس پتھر کے اِرد گِرد ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ گھسنے والے، بھیڑ کو چیرتے پھاڑتے سنگِ اسود تک پہنچنے کی کوششوں میں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب کچھ کھو بیٹھے ہیں، گویا خواجہ حافظ کی مشہور غزل کے اشعار مجسم ہو کر سامنے کھڑے تھے، فرماتے ہیں۔

چہ رہ بود اینکہ زد در پردہ مطرب   کہ می رقصند باہم مست و ہوشیار
ازیں افیوں کہ ساقی در مے افگند   حریفاں را نہ سرماند نہ دستار

مطرب نے پردۂ ساز پر کیسی لَے چھیڑی، کہ دیوانہ اور ہوشیار سب رقص میں آگئے۔ ساقی نے شراب میں جو افیون ڈال دی، نہ ے نوشوں کو ہوش رہا نہ دستار سلامت رہی۔

دیکھتا تھا اور دل کہتا تھا۔

خرد ہر چند نقدِ کائنات است   چہ سنجد پیشِ عشقِ کیمیا کار

عقل اگرچہ متاعِ کائنات ہے، لیکن عشقِ کیمیا گر کے مقابلے میں اس کی کیا حیثیت۔

"عشقِ کیمیا کار" کی گرمیٔ بازار کا حال دیکھنے سے ہی تعلق رکھتا تھا۔ نہ بڑوں کی بڑائی باقی تھی اور نہ چھوٹوں کا چھوٹ پنا۔ لوگ تھے کہ گرے پڑتے تھے اور پکارنے والا پکار رہا تھا۔

سکندر را نمی بخشند آبے   بزورِ زر میسر نیست ایں کار

سکندر کو (بھی) پانی نہیں دیتے، یہاں زر کی قوت سے یہ نعمت حاصل نہیں ہوتی۔

یہ مبالغہ نہیں واقعہ ہے، اپنی آنکھوں دیکھی بات ہے کہ لاکھوں میں نہیں تو یقیناً ہزاروں میں چند ہی خوش قسمت تھے جو کسی نہ کسی طرح انسانی بحرِ مواّج کو چیرتے پھاڑتے کعبہ کے اس سیاہ پتھر تک براہِ راست پہنچنے میں کامیاب ہوتے تھے۔ دردناک منظر غریب نجدی حاجیوں کا تھا۔ سنگ دلی میں حالانکہ ان کی شہرت ہے، لیکن اس سیاہ سنگ کے عشق میں آج بجائے دل کے ان کے سر گویا پتھر کے بنے ہوئے تھے۔ سعودی حکومت کی پولیس کے جوان ہاتھوں میں بید لیے ہوئے حجرِ اسود کے گرد کھڑے ہوئے تھے۔ نجدی دیوانہ حاجی ہر چیز سے بے پروا ہو کر، استلام کو ناکافی ٹھہراتے ہوئے، حجرِ اسود کو بوسہ دینے کے لیے جان پر کھیل کر جب حجرِ اسود تک پہنچ جاتا، اور بوسہ کے لیے اپنے سر کو جھکاتا، تو اچانک تڑاتڑ انتہائی بے دردی کے ساتھ نجدی پولیس کے سپاہی کی بید اس غریب کے سر پر برسنے لگتی۔ بید پر بید سپاہی مارتا جارہا ہے، لیکن پتا چلتا تھا کہ ان کو نجدی حاجی پھول سمجھ رہا ہے، سنگِ اسود کے ساتھ لپٹا ہوا ہے۔

طوافِ قدوم کے ابتدائی مناسک ہی میں ان باتوں کا اندازہ ہوگیا' میرے لیے نہ نجدی حاجیوں کے سروں کی سنگینی آسان تھی' اور نہ دل اس پر راضی ہوتا تھا کہ استلام کی شکل میں شرعی مطالبہ کی تکمیل کرکے آگے بڑھ جاؤں۔ سوچ بچار کر اس راحت طلب دل نے یہی صورت نکالی کہ اپنا بسترا ہی کسی کی دیوار کے نیچے ڈال دیا جائے۔ چوبیس گھنٹوں میں آخر کوئی وقت' دن کو نہ سہی رات کی پچھلی گھڑیوں ہی میں' شاید ایسا مل جائے کہ کھُل کر دل کی آرزو پوری کرلوں۔

رفیقوں نے اجازت دے دی۔ سب سے الگ ہو کر' باب ابراہیمؑ کی سمت میں' حرم شریف کے ایک گوشہ میں اپنا بسترا ڈال دیا۔ ڈر تھا نجدی سپاہی کی ٹھوکروں کا' ڈر تھا بھری محفل میں اٹھا دیے جانے کی رسوائی نہ پیش آئے۔ اس رسوائی کی برداشت پر دل کو آمادہ کرلیا گیا تھا' لیکن شکر ہے کہ ایسی صورت کبھی پیش نہ آئی۔

اب ہم تھے' اور کعبہ مکرمہ و مقدسہ کی دید و دام کا تماشا۔ دیکھتے دیکھتے جب طبیعت میں نشاط کی کیفیت پیدا ہوتی' اٹھتا اور کسی کے گھر کے چاروں طرف رقص کا مشغلہ شروع ہوتا۔ دن کو تو خیر ناممکن تھا اور رات میں بھی بارہ ایک بجے تک طوافی تلاطم کا جوش موجیں ہی مارتا رہتا' لیکن رات جب کافی بھیگ جاتی' اڑھائی تین بجے تک نسبتاً" طواف کرنے والوں کی تعداد گھٹ گھٹا کر اس نقطہ تک پہنچ جاتی کہ مجھ جیسے کمزور جسم و جاں والوں کے لیے بھی حجرِ اسود تک براہِ راست رسائی گو نہ آسان ہو جاتی تھی۔

بات کیسے چھپاؤں۔ روایات کی روشنی میں حجرِ اسود جو کچھ میرے لیے تھا' میرے لیے وہ نمائندگی کررہا تھا آدمؑ و شیثؑ' ادریسؑ و نوحؑ کے ساتھ ساتھ قوموں کے امام ابراہیم خلیل اور ان کے فرزند ذبیح علیہما السلام کے مبارک ہاتھوں کی بھی' اور یقین کی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ بغیر کسی شک و شبہ کے کعبہ کا یہ وہی پتھر ہے جسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک کے لَمس اور لَبِ اَقدس کے بوسہ کی سعادت قطعی طور پر حاصل ہوئی ہے۔ الغرض نہ پوچھیے کہ ایمان کی آنکھوں سے ذہن کہاں کہاں تک پہنچتا تھا' اور اڑتا ہوا دماغ کن بلندیوں کو چھو چھو لیتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ مخلوقات سے گزر کر خالق تک کے یمین (دست راست) کی تجلی اسی سیاہ پتھر سے تڑپ تڑپ کر نکل رہی تھی' اور ایمان کی آنکھ یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

لیکن اسی کے ساتھ اب کیا بتاؤں کہ پہلی دفعہ رات کی پچھلی گھڑیوں میں جب حجرِ اسود کے چومنے کی سعادت سے سرفرازی میسر آئی' اس وقت میں نے کیا پایا۔ کوئی تشبیہ سمجھ میں نہیں

آتی۔ کچھ ایسا معلوم ہوا کہ کوند کر کوئی بجلی تھی جو چاندی کے پتروں میں مڑھے ہوئے اس کالے پتھر کے ان ٹکڑوں سے میرے ظاہر و باطن میں جذب ہوگئی۔ ناقابل بیان سرور و نشاط کا ایک کیفِ مجہول تھا' جو میرے وجود میں ہلچل مچائے ہوئے تھا۔ ایک حال تھا ' نہیں کہہ سکتا کہ کیا حال تھا۔ باہر کی کوئی تاثیر تھی یا ایمانی مشاہدات کے نتائج نے ناسوتی رنگ اختیار کرلیا تھا۔

دیوارِ حرم کے نیچے کی چند دن کی یہ زندگی ساری زندگی کے اوقات میں سب سے زیادہ قیمتی تھی۔ . . .

منیٰ کی طرف

میرا اونٹ بڑھتا چلا جاتا تھا۔ ڈگ مگ' اونچے نیچے ہوتے ہوئے' وہ تو منیٰ کے میدان کی طرف جارہا تھا' اور یہاں دیوانے کے لیے وادی مکّہ کی ہواؤں کی سنسناہٹ نے "ہو" کا کام کیا۔ "رُوح" کو تو کیسے کہوں' کہ "روحانیت" والے ہی جانیں روح کیسے کھلتی ہے' لیکن دماغ کے پٹ کھُل گئے۔ مطالعہ کے معلومات مجسّم و متشکّل ہو ہو کر سامنے آنے لگے۔

اللہ کے خلیل ابراہیم اواہ و صلوات اللہ علیہ وسلامہ کی اسی وادی میں آمد و رفت کا زمانہ ایسا معلوم ہوتا تھا' ماضی کے پردوں کو چاک کرکے' میرے روبرو کھڑا ہوا ہے۔ ایک ایک واقعہ' جس کا ذکر کتابوں میں کیا گیا ہے' یاد آتا جاتا تھا۔ شکار کے لیے حضرت ابراہیمؑ کے صاحبزادے' حضرت اسماعیل علیہ السلام ان ہی میدانوں میں نکلتے ہوں گے' جراہمہ سے ان کے سسرالی تعلقات' جراہمہ کا دورِ حکومت' جراہمہ کے بعد عمالقہ کے جبروزور کے افسانے' اسماعیلی نسل کی ملوکیت' ان کے گزرے ہوئے سلاطین' ان کے خزانے' ان کی معدنی دولت' ملوک بنی خزاعہ کا مکّہ کی حکومت پر استیلا' خزاعی بادشاہوں میں عمرو بن لحی کا عہدِ اسلامی سے تین ساڑھے تین صدی پہلے مکّہ معظمہ میں ان اَصنام کو لانا' جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ابتدا ان کی عہدِ نوح میں ہوئی اور' بقول سہیلی' ہندوستان میں وہی بُت اور مورتیاں کسی زمانہ میں پہنچیں۔

عرب کے کھُلے ہوئے اس میدان میں' ذہن کو کھل کھیلنے بلکہ زقندوں کے بھرنے کا خوب موقع ملا۔ اسی راستہ سے' یمن کے حبشی ہاتھی والے جو کعبہ کو گرانے کے لیے آئے تھے' یعنی اصحابِ فیل' بھاگے تھے' اور اسی راستہ کی مختلف منزلوں پر' جیسا کہ ایّامِ جاہلیت کے شعُرا نے ذکر کیا ہے' حبشیوں کی لاشیں گل گل کر گرتی چلی جاتی تھیں' جن کو پرندوں سے جھڑنے والی کنکریوں نے عَصفٍ مَاکُول (کھایا ہوا بھوسہ) گویا گوبر بنا کر رکھ دیا تھا۔

بڑھتے ہوئے سامنے قربانی کا وہ میدان' منیٰ نام والا' بھی آہی گیا۔ اسی وادی میں دو باپ بیٹے

ابراہیم خلیلؑ و اسماعیل ذبیحؑ ' اللہ کے ان دونوں راستباز مخلص بندوں نے اس دین کا پہلا سنگِ بنیاد نصب کیا تھا جس دین کے ماننے والوں کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ اپنا سب کچھ اسی کے سپرد انھوں نے کردیا جس کا سب کچھ ہے۔ جو قرآنی الفاظ فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ جب دونوں باپ بیٹے مسلمان ہوگئے اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل پٹک دیا' (الصفت ۳۷ : ۱۰۳) کا کھلا ہوا اقتضا و مفاد ہے۔ اسی دن کے "اَسْلَمَا" نے' اس دین کو پیدا کیا جس کا نام "اِسلام" ہے۔۔۔۔

سوئے عرفات

صبح ہوئی' اونٹ موجود تھے۔ خیمہ خرگاہ سب لَد گیا' اور اس وادی کی طرف انسانوں کا سیلاب چل پڑا جس میں تاریخ کے نامعلوم زمانہ سے نسلِ انسانی کی غیر معمولی تعداد اکٹھی ہوتی رہی ہے' اوران شاء اللہ رہتی دنیا تک ہوتی رہے گی۔ چلے جارہے تھے' صبح کا سہانا وقت تھا' بے آب و گیاہ' بے سنگ و میل وادی کے ان چٹیل میدانوں میں جن میں شمالاً و جنوباً" شرقاً" و غرباً" پست پہاڑیوں کی قطاریں پھیلی ہوئی تھیں۔

خیال آتا کہ یہ کتنا بڑا میلہ ہے ! پھر وسوسہ ہوتا کہ دنیا میں میلوں ٹھیلوں کی کیا کمی ہے' قوموں کی یہ عام عادت ہے۔ دل جواب دیتا' یہ نہ دیکھو کہ کتنے لوگ جمع ہوئے' بلکہ یہ سوچو کہ انسانیت کا یہ اجتماع کس کے لیے ہو رہا ہے ؟

ناچنے' گانے بجانے' تھرکنے' پینے پلانے' کھُل کھیلنے کے مخلوط و غیر مخلوط میلوں کو تو جانے دیجیے' دین اور دَھرم کی چھاپ جن میلوں اور ٹھیلوں پر لگائی جاتی ہے' دین ہی کے نام پر لوگ اکٹھے ہوتے ہیں' اس باب میں ان کا حال کیا ہے ؟ واقعہ بتا رہا ہے کہ جمع ہونے والے جہاں کہیں بھی جمع ہوتے ہیں' کسی مخلوق ہی کے نام پر جمع ہوتے ہیں۔ یَلِدُ اور یُوْلَدُ کے داغ سے کسی کا دامن پاک نہیں۔ اِلاَّ یہ کہ زمین کے اس سارے کرّہ پر' ایشیا و افریقہ' یورپ و امریکہ کے بیچ میں' عرفات ہی کے میدان کا میلہ وہ میلہ ہے جس میں اکٹھے ہونے والے بلا خوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ کائنات کے خالقِ قدّوس اور صرف کائنات کے خالق قدوس' ہی کی بزرگی اور بڑائی کے نعروں کے ساتھ اکٹھے ہوتے ہیں۔ اسی کے قدموں پر لوٹنے کے لیے زندگی کی ساری کوتاہیوں کی تلافی کے لیے چلے آتے ہیں۔۔۔۔ کچھ اسی قسم کے خیالات میں ڈوبے ہوئے ہم بالآخر اس موقف اعظم تک پہنچا ہی دیے گئے جہاں کے وقوف اور قیام کے بغیر حج کے قالب میں حج کی رُوح پیدا نہیں ہوتی۔ یہی حج کا رکنِ اکبر ہے' جس کے بغیر کسی کا حج' حج نہیں ہوتا۔۔۔۔

عرفات میں

ایک طرف دن بھی پگھلتا چلا جارہا تھا' اور اسی نسبت سے دل بھی پگھل رہے تھے۔ اللہ اللہ خیموں کے اندر کی چیخ و پکار' گریہ و بکا' نالہ و زار' توبہ و استغفار' شاید زمین بھی کانپ رہی تھی' آسمان بھی تھرا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے بیگانہ ہوتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی مخلوق کو دوسری مخلوق کی خبر نہیں۔ سامنے سب کے گویا صرف ان کا اَرحَم الراحِمِین' غَافِرِ الذنب' قابل التوب' الغفور الرحیم' خالق کے سوا کوئی دوسرا باقی نہ رہا تھا۔

اپنے وجدان کے آئینے میں مجھے تو کچھ ایسا دکھایا جارہا تھا کہ ہر ایک کا ماضی' حال کے مرقع میں کھنچ کر ہر ایک کے سامنے گویا کھڑا ہے۔ خیر کے متعلق تو نہیں کہہ سکتا لیکن قرآنی آیت' يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوٓءٍ ہر شخص نے جو کچھ بھلا بُرا کیا ہے اس دن اس کو حاضر پائے گا (آل عمران ۳ : ۳۰)' میں سُوٓءٍ (برائی) کے جس ثانوی ظہور کی اطلاع دی گئی ہے' اسی واقعہ کی ایک جھلک آج دکھائی جارہی تھی۔ اور یوں اس حال میں يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ؀ اس دن واپس ہوں گے لوگ بکھرے ہوئے تاکہ دیکھیں اپنے کرتوتوں کو (الزلزال ۹۹ : ۶)' کا استقبالی نظارہ بھی جھانک رہا تھا۔ گویا یوں سمجھیے کہ ماضی حال' اور حال مستقبل' بناہوا تھا۔ تینوں زمانے ایک دوسرے میں آج مدغم ہو کر ایک ناقابلِ بیان کیفیت کو پیدا کیے ہوئے تھے۔

دیوانوں کے لیے "ہو" "بس" ہوتی ہے۔ پھر جہاں ہاؤ ہو' شور وغل کے ہنگاموں کا یہ حال ہو' سوچا جاسکتا ہے کہ عقل سوختوں پر ان کا کیا اثر ہو سکتا تھا۔ جاننے پہچاننے والے رفیقوں کے لیے "مجہول مطلق" بن جانے' یا بنا دیے جانے' کی زحمت میں رحمت کا جو مخفی پہلو تھا' اب سامنے آیا۔ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ' پکڑ لیا عزت (کے خیال) نے اس کو گناہ کے ساتھ (البقرہ ۲ : ۲۰۶)' کے نفسیاتی نزغ کی جڑ ہی گویا کٹ چکی تھی۔ مولویت' پروفیسریت' خطابت' اور خدا جانے اور کیا کیا بلا' اس قسم کے جتنے لفافے اوپر سے چڑھے ہوئے تھے' پھٹ پھٹ کر عرفاتی جھونکوں کی نذر ہو چکے تھے۔

کتابوں میں وادیِ عرفات میں آنے والی عرفانی ہستیوں کے جو تاریخی اقوال یا نعرے پڑھنے میں آئے تھے ایک ایک کرکے آج یاد آتے چلے جاتے تھے۔ سب سے زیادہ دُھننے والا جس پر سر دُھن رہا تھا' وہ اس راہ کے مشہور راہی فضیل بن عیاضؒ کے قلبِ مبارک کی پکار' اسی وادی میں' اسی دن' ان کی جان کی یہ بے پناہ کراہ' وَاسَوْاَتَاه وَاِنْ غَفَرْتَ لِیْ' ہائے رے میری رسوائی

خواہ تو مجھے بخش ہی کیوں نہ چکا ہو' یاد آ آکر تڑپا تڑپا دیتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اُبل اُبل کر فطرت کی باطنی گہرائیوں سے وَاحَسْرَتَا ! عَلٰی مَا فَرَّطْتُّ فِیْ جَنْبِ اللّٰہِ وَاِنْ کُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِیْنَ' افسوس ہے اپنی ان زیادتیوں پر جس کا اللہ کے پہلو میں مرتکب ہوا اور تھا مذاق اڑانے والوں میں' کی موجیں باہر آ آکر ندامت و خجالت میں غوطے پر غوطے دیتی چلی جارہی تھیں۔ اور کیا کیا بتایا جاوے کہ کن کن پر کیا کیا گزر رہا تھا۔

اب آفتاب مغربی افق کے آخری کنارے تک پہنچ چکا تھا' کلیجے خون تھے' آفتاب سرخ تھا' حسرت ویاس کی نگاہ سے ۹ ذوالحجہ کے اس تاریخی دن کو ہر ایک رخصت کر رہا تھا' زندگی بھر کا سودا تھا جو آج چکایا جارہا تھا۔ آنے والوں کو یہاں تک پہنچنے کا موقعہ خدا ہی جانتا ہے کہ کیسے مل گیا تھا۔ کون جانے کہ ختم ہونے کے بعد عرفات کے اس میدان میں مغفرت و آمرزش عام کے اس پاک دن کے گزارنے کا موقع ملے گا۔ بے ساختہ سینوں سے چیخیں نکل رہی تھیں' بلبلانے والے بلبلا رہے تھے' رو رہے تھے' چلاّ رہے تھے۔

(تلخیص و تدوین : خ - م)

جبینِ شوق

رئیسہ عزیز

میں نقشِ پا پہ ان آنسوؤں کو بھی سجدہ کرنا سکھا رہی ہوں

میں حج کی سعادت سے محروم ہوں۔ میری آنکھیں انوارِ الٰہی کے ان جلوؤں سے محروم ہیں جو مسجدِ حرام اور خانہ کعبہ کا احاطہ کیے رہتے ہیں۔

میں نے کبھی احرام نہیں باندھا' کبھی طواف نہیں کیا' کبھی سعی نہیں کی۔ نہ حجرِ اسود کو بوسہ دیا ہے' نہ غلافِ اطہر کو آنکھوں سے لگایا ہے' نہ خانۂ خدا کے درِ مستجاب پر سجدہ ریزی کی ہے' نہ زم زم سے تشنگی بجھائی ہے۔

وہ قافلے' وہ کارواں جو حج کی سعادتوں سے جھولیاں بھر کر عازمِ بطحا ہوتے ہیں' مجھے ان میں سے کسی کی ہمرکابی کا شرف حاصل نہیں ہوا' میں نے مدینۃ النبی کی گلیوں میں آبلہ پائی نہیں کی' روضہ نبی کے حضور دست بستہ درود و سلام کے پھول نچھاور نہیں کیے ہیں۔

وہ سبز گنبد' وہ سفید مینار' وہ بلند دروازے' وہ ستونوں کی قطاریں' وہ محرابیں' وہ منبر' وہ زمردیں جالیاں' جو روضہ حبیب کبریا کا احاطہ کیے ہوئے ہیں' میں تادمِ تحریر ان کے دید کی سعادت و شرف سے محروم ہوں۔ لیکن تقدیر اور تدبیر کی کشمکش سے بالاتر' میرے جسمِ خاکی میں ایک روح بھی ہے۔ ان گناہگار آنکھوں سے سوا ایک چشمِ تصور بھی ہے۔ مجبوری اور معذوری کی زنجیروں سے آزاد ایک نعمتِ تخیل بھی ہے۔

اور اپنی اسی پیاسی روح' اسی چشمِ تصور اور اسی نعمتِ تخیل کے سہارے میں ہر اُس قافلے کے ہمراہ ہوتی ہوں جو عازمِ بیت اللہ ہوتا ہے۔

نگاہِ شوق میں خانۂ خدا کا تصوراتی خاکہ حقیقت سے قریب تر ہوتا ہے۔ وہ جو لَاتُدْرِکُہُ الْاَبْصَار بھی ہے' وَاَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْد بھی۔ اسی کے نام کے ساتھ وابستگی نے تو خانہ کعبہ' غلافِ

کعبہ اور اطراف کو عظمت و جلال کا ایسا عنوان بنا دیا ہے کہ دلوں کی دنیا تہ و بالا ہوئی جاتی ہے۔

لرزاں و ترساں میں طواف کرتی ہوں' سعی بھی کرتی ہوں۔ حجرِ اسود کو بوسہ دیتی ہوں' ربِ کریم کی چوکھٹ پر سر جھکا کر آہ و زاری بھی کرتی ہوں۔ اپنی کم مائیگی' اپنی بے بسی' اپنے دکھ درد' اپنی حاجتیں' اپنی محرومیاں' اپنے گناہ' اپنی بے عملی' سب کچھ اسی ربِ بزرگ و برتر کے درِ مستجاب پر ڈھیر کر دیتی ہوں۔

وہ جو رب ہے' معبود ہے' سمیع و بصیر ہے' علیم و خبیر ہے۔ وہ جو سنتا ہے پکارنے والے کی پکار' اور وہ جو رگِ گلو سے بھی قریب تر ہے۔

اس کی چوکھٹ سے جب سر اٹھاتی ہوں تو بارِ عصیاں کی سرگرانی باقی نہیں رہتی۔ اپنی بے نوائی' بے بسی اور بے کسی کا کرب باقی نہیں رہتا' اپنی محرومیوں کا اضطراب باقی نہیں رہتا۔

ربِ ذوالجلال کی عظمت اور اس کے اقتدارِ اعلیٰ کی مظہر یہ چہار دیواری' جو خدا کا گھر ہے۔ اس کی دید سے بصیرت اور بصارت کو سیراب کرتی ہوں تو دلِ حزیں یہ پکار اٹھتا ہے کہ بندگی رب کے تقاضے پورے ہوں تو یہ دلِ حزیں بھی خانۂ خدا ہے۔ وہ مظہرِ شانِ کبریا ہے' یہ مسکنِ نورِ یزداں ہے۔

بندگی اور وابستگی کے احساس سے سرشار ہو کر' عطربیز ہواؤں کے دوش پر میرا تصوّر مجھے کشاں کشاں بطحا لیے چلتا ہے' تو میں عقیدت کے پھول اور عشقِ نبی کی کلیاں چنتی جاتی ہوں۔ گلہائے عقیدت کی ان مالاؤں کے ساتھ جب صحنِ مسجدِ نبویؐ تک پہنچتی ہوں' تو ایک لمحہ کے لیے رُک کر اس رُوح پرور منظر سے اپنی تشنہ کامی کو سیراب کرتی ہوں۔

یہ محرابیں' یہ ستون' یہ فرشِ مرمریں' یہ بام و در' یہ زمردیں جالیاں' یہ منبر' یہ نقش و نگار' یہ روشن قمقمے' یہ جگمگاتے فانوس' یہ جھلملاتی روشنیاں --- مسجدِ نبویؐ کا ہر ہر گوشہ' عقیدت مندوں کے ذوقِ جمال کا مظہر ہے۔

لیکن مرکزِ انوارِ الٰہی ان برقی قمقموں اور آرائش و زیبائش کا مرہونِ منت نہیں۔

یہ آرام گاہِ سرکارِ دو عالم ہے۔

جس نے معرفت کی قندیلوں سے سارے عالم کو منوّر کیا۔

جس کی نبوت اور رسالت نے بندوں کا رشتہ اپنے معبود سے استوار کیا۔

جو خاتمِ نبوت ہے' جس پہ اللہ نے دین کی تکمیل کی۔

جو محبوبِ رب العالمین ہے۔

جو صاحبِ معراج بھی ہے اور معراجِ انسانیت بھی۔
جو امین ہے پیغامِ حق کا اور جس پر ربِّ ذوالجلال اور اس کے فرشتے درود و سلام بھیجتے ہیں۔
یہاں کا تو ہر ذرہ رشکِ آفتاب ہے کہ یہ ذرّے بھی نقشِ کفِ پائے رسولؐ کے امین ہیں۔
اس مرمریں فرش تلے وہ ذرّے آج بھی جگمگا رہے ہوں گے جنھیں قدم بوسی کا شرف حاصل تھا۔ وہ ذرّے جنھوں نے پیشانی اقدس کو دورانِ سجود بوسہ دیا ہو گا' وہ ذرّے جو طویل قیامِ لیل میں قدموں سے لپٹ لپٹ گئے ہوں گے' وہ ذرّے جنھوں نے اُمّت کے لیے اشکِ گہربار کے آبدار موتی اپنے اندر جذب کر لیے ہوں گے۔

اے نقشِ کفِ پائے رسولؐ کے امینو --- کہاں ہو تم ؟؟!!

روضۂ رسول کے سامنے میری روح ماہیِ بے آب اور میرا قلب مرغِ بسمل ہے۔

اے قلبِ مضطر' اے روحِ مجروح' اے آہِ نارسا' فرطِ ضبط کے بند توڑ کر سیلِ رواں بن جانے والے آبگینو! ٹھہر جاؤ' رک جاؤ۔ میری پلکوں کے آبی پردوں کے پس پردہ جو منظر ہے اسے دیکھ لینے دو۔ یہ آبی پردے ٹوٹ گئے تو وہ منظر گم ہو جائے گا' وہ سرمایہ کھو جائے گا' وہ حقیقت اوجھل ہو جائے گی جو رنگ و نور کا غبار بن کر ابھر رہی ہے۔ اس تصوّر کا تسلسل بکھر جائے گا جو روشن ماضی کے دھندلکوں سے ابھر رہا ہے۔

کچی اینٹوں اور مٹی کے گارے سے بنا ہوا ایک مختصر سا حجرہ' جس کے اختصار پر ساری دنیا کی وسعتیں قربان ہیں۔ کمزور سی دیواریں جن کی درزوں سے دھوپ اندر آتی ہے۔ اس حجرے میں ایک ہی دروازہ ہے' جس میں نہ چوکھٹ ہے نہ پٹ ہیں۔ ایک کمبل آویزاں ہے۔ یہی پردہ ہے' یہی آرائش ہے اور یہی دروازہ ہے۔

یہ حجرہ جو سامانِ زیست کے جملہ لوازمات سے یکسر خالی ہے۔ لکڑی کا ایک پیالہ' چمڑے کا گدا جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی ہے' بان کی ایک چارپائی' ٹاٹ کا ایک ٹکڑا اور ایک چٹائی۔ یہی کُل گرہستی ہے۔

یہی تو وہ حجرہ ہے جو نورِ نبوّت سے جگمگا رہا ہے۔ لیکن چالیس چالیس راتیں ایسی گزر جاتی ہیں کہ چراغ روشن کرنے کے لیے تیل میسر نہیں۔

اس حجرے میں سامانِ خورد و نوش کہیں نظر نہیں آ رہا ہے کہ مٹھی بھر جو اور چند کھجوریں۔ ہوئیں ہوئیں نہ ہوئیں تو نہ ہوئیں۔ مہینوں چولہے میں آگ روشن نہیں ہوتی کہ فقر و فاقہ ہی شعارِ سرورِ کونین ہے۔

میری پلکوں پر آبی پردے لرز کر بکھر جاتے ہیں۔ بند آنکھوں میں یہ منظر سمیٹنے میں چند لمحوں کے لیے اپنے گردوپیش سے بے خبر ہو جاتی ہوں۔

آنکھیں کھلتی ہیں تو ہر سو وہی رنگ و نور کا سیلاب ہے، وہی روشن قندیلیں ہیں، وہی جگمگاتے فانوس ہیں، وہی نقش و نگار ہیں، وہی منبر و محراب ہیں، اور وہی انبوہِ عاشقانِ رسولؐ ہے، گریہ و زاری ہے، درود و سلام ہے، موذن کی پکار اور نمازیوں کی صفیں ہیں۔

وہ حقیقت بھی برحق ہے اور پیشِ نظر یہ مناظر بھی برحق ہیں۔ لیکن ان دونوں میں جو تعلق اور رابطہ ہونا چاہیے مجھے اس کی جستجو ہے۔ میری نگاہوں میں وہ منظر ابھرتا ہے کہ ولید بن عبدالملک کے حکم پر مسجدِ نبوی کی توسیع کے لیے حجراتِ ازواج النبیؐ اور نبی مکرمؐ کے حجرے منہدم کیے جا رہے ہیں اور شہر مدینہ میں کہرام مچا ہوا ہے۔ ہر فرد بے قرار ہے، ہر دل بے قرار ہے، ہر آنکھ اشکبار ہے۔ حضرت سعید بن مسیبؒ کی آواز میرے کانوں میں گونجتی ہے کہ "کاش! رسولِ خدا کے حجروں کو بحال رہنے دیا جاتا، تاکہ لوگ دیکھا کرتے کہ شہنشاہِ دو عالم اور آپؐ کے اہلِ بیت نے اس دارِ فنا میں حیاتِ مستعار کس طرح گزاری"۔

حضرت سعید بن مسیبؒ کی یہ آرزو ہی شاید میری جستجو کی منزل ہے۔ انہدامِ حجرۂ نبیؐ کا کرب میری روح کا آزار بن جاتا ہے۔ اس کرب کو میں اپنے آپ میں سمیٹ لیتی ہوں، کہ چشمِ خونناب میں ایک اور خاکہ ابھرتا ہے۔

حضرت حفصہؓ اپنے والد ماجد حضرت عمرؓ سے فرماتی ہیں کہ "جب دیار و امصار سے مالِ غنیمت آیا کرے تو اس سے بہتر لباس زیب تن کیا کیجیے اور اس کھانے سے عمدہ کھانا تناول فرمایا کیجیے۔"

حضرت عمر فاروقؓ انھیں جواب دے رہے ہیں:

حفصہؓ! شوہر کا حال بیوی سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔ تم حضور نبی کریمؐ کا حال خوب جانتی ہو۔ تمھیں خدا کی قسم ہے، بیان تو کرو کہ حضورؐ پر کتنے برس ایسے گزرے ہیں کہ آپؐ اور آپؐ کے اہلِ بیت اگر صبح کو سیر ہو کر کھانا کھاتے تو رات کو بھوکے رہتے، اور اگر رات کو آسودہ ہو کر کھاتے تو دن کو بھوکے رہتے، اور تمھیں قسم ہے خدا کی، تم جانتی ہو کہ فتح خیبر کے دن تک کئی برس آپؐ کو پیٹ بھر کر چھوارے بھی نصیب نہیں ہوئے تھے۔ اور تمھیں قسم ہے خدا کی، تم جانتی ہو کہ ایک دن خوان میں آپؐ کے سامنے کھانا رکھا گیا تو آپؐ کو یہ امر ایسا غیر مستحسن معلوم ہوا کہ چہرہ مبارک کا رنگ متغیر ہو گیا۔ حتیٰ کہ آپؐ کے ارشاد کے مطابق کھانا زمین پر رکھ دیا گیا۔ اور تمھیں قسم ہے خدا کی، تم جانتی ہو کہ جب آپؐ سوتے تو کملی کے دو تہ کر کے سوتے تھے۔

ایک دن چار تہ کرکے کملی بچھادی گئی۔ وہ زیادہ نرم ہو گئی' تو دوسرے دن آپؐ نے فرمایا' رات کو اس کی نرمی نے مجھے نمازِ شب سے باز رکھا' دو سے زیادہ تہیں نہ بچھایا کرو۔ اور تم جانتی ہو کہ آپؐ کپڑے دھونے ہی میں مصروف ہوتے' یہاں تک کہ بلالؓ اذان کہہ دیتے۔ لیکن جب تک وہ کپڑا خشک نہ ہو جاتا آپؐ باہر نہ نکل سکتے' کیونکہ آپؐ کے پاس دوسرا کوئی کپڑا نہ تھا۔

حضرت حفصہؓ کہہ رہی ہیں کہ ہاں میں یہ سب جانتی ہوں۔ اور پھر دونوں زار و قطار روتے ہیں۔ اور روتے روتے بے ہوش ہو جاتے ہیں۔

حضرت عمرؓ خلافت کی امانت کے امین' سکھ اور آسودگی کے تمام لوازمات سے کنارہ کش ہو گئے ہیں۔ یہی عشقِ نبیؐ کا وہ جذبہ صادق ہے جس نے آپ کو فاروق اعظم بنا دیا ہے۔

صبرو رضا' سادگی اور پیروی رسولؐ کا یہ منظر۔ شاید یہی میری جستجو کی منزل ہے۔

نورِ نبوّت مسجد سے طلوع ہوتا ہے۔ چہرہ مبارک پر فاقوں کا اثر نمایاں ہے۔ کچھ دُور جاتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ آ ملتے ہیں۔ چہرے کا اِضمحلال صاف شہادت دے رہا ہے کہ کیفیت آپ کی بھی مختلف نہیں۔ دونوں کچھ آگے بڑھتے ہیں تو حضرت عمرفاروقؓ بھی ہم قدم ہو جاتے ہیں۔ کیفیت آپ جناب کی بھی وہی ہے جو سرکار دو عالمؐ اور حضرت ابوبکرؓ کی ہے۔

تینوں حضرات ابو طلحہؓ کے گھر کا رخ کرتے ہیں۔ حضرت ابو طلحہؓ تواضع کے لیے ایک بھیڑ ذبح کرتے ہیں۔ اس کو بھونتے ہیں اور روٹی کی ساتھ یہ تازہ پکا ہوا گوشت پیش خدمت کرتے ہیں۔ اس ضیافت کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم روٹی پر چند بوٹیاں رکھ کر فرماتے ہیں "یہ فاطمہؓ کو بھیج دو۔ اس کو بھی آج تیسرا فاقہ ہے"۔

ان آنسوؤں کو اب بہنے نہ دوں گی' نہیں تو یہ مناظر ٹوٹ کر بکھر جائیں گے۔

یہ دولتِ بے بہا اپنی آنکھوں میں سمیٹے' میں روضہ نبیؐ پر الوداعی نگاہ ڈالنا چاہتی ہوں۔ رخصت کی اجازت لینا چاہتی ہوں۔

میرے دل و دماغ میں ایک حشر برپا ہے' میرا ہر نفس سوالی ہے' کہ حیاتِ نبوی کے کون کون سے پہلو ان آرائشوں اور زیبائشوں نے نگاہ سے اوجھل کر دیے ہیں؟

سیرت النبیؐ کے صرف چند اوراق ہی ہمارے ہاتھوں میں رہ گئے ہیں۔ وہ مکمل صحیفۂ زندگی کہاں ہے؟

یہ فانوس تو روشن ہوتے رہیں گے اور انھیں روشن ہونا ہی چاہیے۔ وہ شعلیں دوبارہ روشن کس طرح ہوں گی؟

میری واپسی کا سفر ان قافلوں کے ساتھ نہیں ہوتا جن کے ساتھ میں آتی ہوں۔ بے شمار سوالوں کا ہجوم میرا ہم سفر ہوتا ہے۔

پرِ پرواز آنسوؤں سے بوجھل ہے، اور وہ پیاسی روح، وہ چشمِ تصوّر، وہ نعمتِ تخیل، وہ جبینِ شوق، سب دامن گیر ہیں کہ بدر واحد اور طائف و حنین سے ہو کر گزرنا ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریریں

عبدالقدیر سلیم

اسلوبِ قرآنی کی جھلک

عرب کے وہ قبائل، جن کی بولی ٹکسالی زبان سمجھی جاتی تھی، آپؐ کی زبان کی نشو و نما میں ضرور مددگار ہوئے ہیں، لیکن آپؐ کے کلام پر قرآن کی الہامی زبان کے اسلوب کا اثر بھی واضح ہے۔ اگرچہ قرآن مجید کے اسلوب، زبان اور طرزِ تخاطب میں یکسانیت نہیں۔ لیکن اس تمام بو قلمونی کے باوجود اس کا انداز، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اندازِ کلام سے مختلف بھی ہے۔ تاہم نہ صرف یہ کہ آپؐ کے پیش کردہ نظامِ حیات کے تمام کُلی اصول، قرآن مجید کی الہامی ہدایات سے مشتق ہیں، بلکہ اس الہامی زبان نے آپؐ کے کلام کو بھی ایک منفرد اسلوب عطا کیا ہے، جس کی نقل ناممکن ہے۔ "قرآن مجید" عربی زبان کی سب سے پہلی مدوّن کتاب ہے --- یہ چھٹی صدی عیسوی کے اواخر اور ساتویں صدی کے اوائل میں عربوں کی عقلی و ادبی زندگی کا ایک عظیم مظہر ہے۔ یہی فنی نثر کا بانی مبانی ہے، اور یہی ان کے علوم و معانی و اسالیب کا سرچشمہ ہے، جو اس زمانے کے ادب میں عام ہوئے۔ یہ ایسے اسلوبِ بدیع میں نازل ہوا کہ لوگوں کے ذہن اور کان اس کی نظیر سے قطعاً" نامانوس تھے۔ یہ نہ تو موزوں و مقفیٰ (کلام) ہے اور نہ غیر موزوں اور غیر مقفیٰ عبارت --- اس کے برخلاف اس میں جُدا جُدا آیتیں ہیں، جن میں باہم دگر مشابہت پائی جاتی ہے۔ ہر آیت پر پہنچ کر آواز رک جاتی ہے۔ ذہن اس کی معنویت، نیز قاری کی رُوح و وجدان سے ہم آہنگی کے باعث سکون محسوس کرتا ہے۔ عرب، جو شاعری کے امام اور قوت بیان میں لاثانی تھے، اس کلام کو سننے کے بعد محوِ حیرت ہو گئے۔ انھوں نے اسے نہایت عظیم اور بڑی عجیب چیز قرار

دیا۔ وہ حیران و پریشان تھے کہ کلام کی مروجہ اقسام میں سے اسے کس صنف میں شمار کریں۔ شک اور اضطراب میں انھوں نے کبھی اسے شاعری بتایا' کبھی جادو' اور کبھی کاہن کی سج بندی۔ بہر صورت ان کا قرآن مجید کو ان اصنافِ کلام میں شمار کرنے پر اتفاق کر لینا' جو عقل کو مسحور و مفتون کرتی ہیں' خود اس بات کا پختہ ثبوت ہے کہ اس نے ان کے دلوں پر بہت گہرا اثر کیا تھا۔ ا۔

علامہ مصطفیٰ صادق الرافعی نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس قادرالکلامی پر نہایت جامع تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ "یہ فصاحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں توفیقِ الٰہی بھی تھی' اور توفیقی (یعنی الہامی) بھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو عرب میں مبعوث فرمایا' اور یہ (عرب) وہ لوگ تھے' کہ ان کی تسخیر زبان آوری ہی سے ممکن تھی۔ چناں چہ حسنِ بیان و فصاحت کے باب میں ان کے کارنامے مشہور ہیں۔ پھر یہ کہ زبان و محاورے کے اعتبار سے وہ مختلف گروہوں میں منقسم تھے' اور یہ اختلاف انکے مختلف علاقوں میں رہنے بسنے کی وجہ سے تھا --- ان میں کوئی فصیح تھا' تو کوئی اَفصح' کسی کے کلام میں اضطراب و عجلت نمایاں تھی' تو کوئی سلجھے ہوئے انداز میں ٹھہر ٹھہر کر گفتگو کرتا' بعض کی زبان میں آمیزش تھی' اور بعض کی زبان --- خالص تھی۔ بعض الفاظ مشترک تھے (کہ تمام قبائل میں مروّج تھے) اور بعض مخصوص قبائل ہی کے ساتھ مخصوص تھے۔ بعض قبائل کے الفاظ کی وضعیں (شکلیں) اور صیغے انہی سے خاص اور انہی تک محدود تھے' جن میں عرب کا کوئی دوسرا قبیلہ ان کا شریک و سہیم نہ تھا' سوائے ان لوگوں کے' جو ان میں گھُل مِل گئے تھے' یا ان سے قریب تر ہو گئے تھے ---

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ واحد شخصیت تھی' جو عرب کے ان تمام قبائل کے لغات سے پوری طرح آشنا تھی۔ گویا مختلف زبانوں کے اسالیب نے اپنے اسرار آپؐ پر منکشف کر دیے ہوں' اور ساری حقیقتیں کھینچ کر آپؐ کے سامنے واشگاف کر دی ہوں۔ چناں چہ آپؐ ہر قبیلے سے اس کے مخصوص لب و لہجے اور اس کے منفرد انداز میں خطاب فرمایا کرتے۔ مگر فصاحت اور الفاظ کے صحیح انتخاب اور عبارت کی وضاحت میں آپؐ ان سب سے آگے ہوتے' کہ عرب میں آپؐ کے علاوہ اس کمال میں کسی اور کی مثال نہیں ملتی۔ اگر کسی ایسی شخصیت کا لوگوں کو علم ہوتا' تو اس کی نقل کرتے' اس کا چرچا ہوتا اور اس سے استفادہ کیا جاتا۔

"یہ خصوصیت عرب کے کسی شخص کو اس وقت تک حاصل بھی نہیں ہو سکتی تھی' جب تک اسے پوری طرح اس کی تعلیم و تربیت حاصل نہ ہوتی' یا وہ عرب کے ایک ایک قبیلے میں جا جا کر سالہا سال زندگی نہ گزارتا کہ اس طرح ایک ایک قبیلے کی زبان پر عبور حاصل کر لے' اور ہر ایک کے لب و لہجے میں مہارت حاصل کر لے۔ ہم سب اس امر سے بخوبی آگاہ ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ خود اس کا اہتمام فرمایا' جس کا تذکرہ ہم نے اوپر کیا ہے' اور نہ ان کی قوم کے کسی فرد کے لیے اس طریقے کی تعلیم و تربیت کا کبھی کوئی انتظام کیا گیا۔ یہ بات' علمِ یقینی ہے' محض گمان نہیں --- اتنی یقینی (کہ) --- ہر طرح کے شبہ سے بالا ہے' کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام احوال کا علم تواتر سے منتقل ہوتا ہوا آیا ہے۔ اور پھر عرب کے عام حالات اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ ایسا کوئی شخص نہ تھا' جس نے لغات کی اس طرح تحقیق کی ہو' اس طرح (مختلف قبائل کے) بیان و زبان کے اختلاف کی چھان بین کی ہو' اور سب پر پوری طرح حاوی ہو گیا ہو' تاکہ لوگوں پر اس کی برتری و فوقیت کا سِکّہ جم جائے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ عرب میں ایسے تمام اسباب منقطع تھے۔ ان کا طبعی رجحان بھی اس کے خلاف تھا کہ وہ اس کی طرف راغب ہوتے یا اس کی خواہش کرتے ---

"پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خصوصیت توفیقِ الٰہی اور اللہ کی جانب سے الہام کے سوا اور کیا کہی جا سکتی ہے؟ اس کے سوا کوئی دوسری بات ایسی نہیں' جو آپؐ کی اس خصوصیت کے اسباب میں کہی جا سکے۔ ہمارا یہ فیصلہ کسی گمان کی بنا پر نہیں ہے' کیوں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے ان بہت سی اشیا کا علم عطا فرمایا تھا' جن کو آپؐ جانتے نہ تھے تاکہ آپؐ اپنی قوم کے سامنے عاجز نہ ہوں' اگر وہ آپؐ پر ہجوم کرے۔ اگر وہ کچھ پوچھیں تو آپؐ جواب سے قاصر نہ رہیں۔ تو بھلا پھر ہم آپؐ کی اس ادبی و لسانی خوبی کو توفیقی کیوں نہ قرار دیں؟ اللہ نے آپؐ کو اس خصوصیت سے اس لیے بہرہ مند فرمایا کہ آپؐ کا واسطہ جس قبیلے سے بھی پڑے' یوں محسوس ہو گویا آپؐ اسی میں سے ہیں' تاکہ اچھی طرح اِتمام حجّت ہو جائے' اور آپؐ کی رسالت پوری طرح واضح ہو جائے' اور تاکہ یہ بات بھی جان لی جائے کہ آپؐ کو زبان و ادب میں وہ خصوصیت حاصل ہے' جو تمام عرب میں کسی اور فرد کو حاصل نہیں' اور آپؐ اس صلاحیت و خصوصیت میں بھی ان پر برتری اور فوقیت رکھتے ہیں' جس طرح دوسری بہت سی باتوں میں آپؐ کو ان پر برتری اور فوقیت حاصل ہے۔" ۲۔

محمود راغب الطباخ نے بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس الہامی فصاحت کا

تذکرہ کیا ہے' جو آپؐ کو عرب کے تمام لسانی اختلافات کے باوجود اپنا ایک مخصوص حُسن اور منفرد اسلوب عطا کرتی تھی' اور جن کی وجہ سے آپؐ آج بھی ممتاز مقام رکھتے ہیں۔

"نادر حکمتوں اور عرب کی تمام زبانوں کے علم سے اللہ نے آپؐ کو بہرہ مند کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ عرب کے مختلف قبائل کی جماعتوں کو آپؐ انھی کی زبان میں مخاطب فرماتے' اور انھی کی لغت کے محاورے استعمال فرماتے' اور خود ان کے کلام کی بلاغت میں ان سے بازی لے جاتے ---۔ ایک موقعہ پر آپؐ کے بعض صحابہ نے آپؐ سے کہا کہ ہم نے آپؐ سے بڑھ کر کسی کو فصیح اللسان نہیں دیکھا' تو حضور اکرمؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ میرے لیے فصاحت سے کون سی چیز مانع ہے؟ آخر یہ قرآن میری ہی زبان میں تو نازل ہوا ہے' جو عربی مبین ہے ۳۔ اسی طرح حضرت ابوبکرؓ نے آپؐ سے پوچھا: میں سارے عرب میں گھوما پھرا ہوں' اور میں نے ان کے فصحاء کو سنا ہے' لیکن میں نے آپؐ سے زیادہ فصیح کسی کو نہ پایا' بھلا آپؐ کو یہ ادب کس نے سکھایا؟ آپؐ نے فرمایا: **ادبنی ربی فاحسن تادیبی**' یعنی میرے رب نے مجھے سکھایا ہے اور مجھے اچھی تعلیم دی ہے ۴۔ یہی جواب آپؐ نے حضرت علیؓ کو بھی دیا تھا' جب بنو ہند کا وفد آیا' اور آپؐ نے ان سے انھی کی زبان میں بات چیت کی۔ حضرت علیؓ نے جو خود بھی زبان پر بڑا عبور رکھتے تھے' تعجب سے پوچھا "یا رسول اللہؐ ہم ایک ہی دادا کی اولاد ہیں' لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آپؐ عرب کے وفود سے ایسی زبان میں گفتگو فرماتے ہیں' جس کا بیشتر حصہ ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتا؟' آپؐ نے فرمایا: **ادبنی ربی فاحسن تادیبی**۔۵۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے' فصاحت' اور زبان کے خوب صورت و موثر استعمال کا شوق عہد جاہلیت کے عربوں کو بھی تھا۔ لیکن کلام کے حُسن اور نکھار میں ان کی "آمد" بھی "آورد" کا پتہ دیتی تھی:

"---۔ اہلِ عرب نے اگرچہ کلام کی تہذیب کی' اور اس میں انھوں سے بڑی مہارت حاصل کر لی تھی' اسے مستحکم کرنے' اور محاسن سے آراستہ کرنے میں انھوں نے بڑی کوشش کی تھی۔ لیکن یہ جو کچھ تھا' سب اسی نہج پر ہوا تھا' جو پہلے سے چلی آ رہی تھی' اور پیش پا افتادہ تھی' جس میں تکلف اور کوشش کا دخل ہوتا ہے' جس میں تصنع کے ایسے ساز و سامان سے مدد لی جاتی ہے' جن تک لوگوں کی لغوی مہارت کی رسائی ہوتی ہے' جس کے نتیجے میں کلام مصنوعی اور بیشتر تکلف محسوس ہوتا ہے۔ ان کوششوں کے باوجود ان کے کلام ناگواری

لغزشوں اور اضطراب و انتشار کے عیوب' نیز بسط و تفصیل کے موقع پر اختصار' اور اختصار کے موقع پر طوالت' ایسے کلمہ کا استعمال' جس سے زیادہ موزوں لفظ موجود ہو' یا ایسی بات کہہ جانا' جو مراد نہ ہو' اس طرح کے عیوب سے یہ لوگ پاک نہ رہ سکے۔

"پھر مضامین کے باب میں ان کے پاس اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ وہ یا تو تجربے کی دانائی سے فائدہ اٹھائیں' یا تھوڑا بہت ایک دوسرے سے اخذ کر کے فضیلت حاصل کریں۔"

-۶

قدیم اہل عرب کے ہاں کلام کی خوبی اور فکر و بیان کی قدر و قیمت کا پیمانہ یہی تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ایجاز و اختصار بھی محاسن کلام میں شمار کیے جاتے تھے' لیکن اکثر الفاظ کی کثرت اور مطالب کی تکرار بھی لائق تحسین ہوتی تھی۔ گویا قدیم عرب کی فصاحت کا معیار پُر تکلف عبارت آرائی تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو اگرچہ اس معیار کے مطابق نہ تھی' لیکن آپؐ کا کوئی مخالف بھی اس کو عیب نہ قرار دے سکا' اور نہ اس میں کسی قسم کے عیب یا کمزوری کی نشان دہی کر سکا۔ اس کے برخلاف آپؐ کا اسلوب اور اندازِ بیان' آپؐ کے معاصرین اور متاخرین کے لیے خود معیار بن گیا' اور عربی زبان اور محاورے کو ایک نیا اسلوب عطا ہوا' جس میں عالمانہ متانت اور سنجیدگی بھی تھی' خطیبانہ جوش بھی' ادبی حُسن و دل کشی بھی اور بے تکلف سادگی بھی۔

رافعی مزید کہتے ہیں :

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم افصح العرب تھے۔ باوجود اس حقیقت کے' نہ تو آپؐ اپنی گفتگو میں تکلف و تصنع سے کام لیتے' اور نہ اپنے کلام کی تزئین کے لیے ارادی کوشش فرماتے' نہ ان طریقوں کو استعمال فرماتے جو صنعتِ کلام میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ آپؐ کسی مضمون کے بیان کرنے کا ارادہ فرماتے' تو اس کی ادائگی میں حد سے آگے نہ بڑھ جاتے۔ پھر نہ تو آپؐ کے کلام سے کوئی ضروری لفظ ساقط ہوتا' اور نہ کوئی ناگوار لفظ ادا ہوتا' اور نہ کوئی لسانی لغزش ہوتی۔ آپؐ' کلام کے مقاصد کے ظاہری تقاضوں سے ہٹ کر کوئی تعجب خیز اسلوب اور دشوار گزار راہ اختیار نہیں فرماتے تھے کہ ذہن کو آپؐ کے کلام میں صحیح راستہ ہی سجھائی نہ دے۔

اور پھر آپ یہ دیکھیں گے کہ حضورؐ صرف انہی مضامین و معانی کو بیان فرماتے' جو نبوت کے الہامات اور حکمت کے نتائج اور عقل کی منزلِ مقصود ہوتے ہیں۔ ان خصوصیات

کے ساتھ آپؐ جو کلام بھی ارشاد فرماتے' اس میں بلاغت' پختگی اور اعتدال کی خوبی کے لحاظ سے آپؐ اس بلندی پر نظر آتے ہیں' جو انسان کی حدِ امکان سے کہیں زیادہ بلند ہے۔"ے

نئے الفاظ' اسالیب' محاورے

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عربی زبان کو ایسے نئے الفاظ' اسالیب اور محاورے بھی دیے جنھیں عربوں نے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ اور نہ آپؐ کے کسی پیش رَو نے انھیں استعمال کیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود آپؐ کے بعد وہ عربی زبان اور محاورے میں داخل ہو گئے۔ صاحبِ اعجاز القرآن اور بعض دوسرے اہلِ بلاغت نے اس کی کئی مثالیں دی ہیں۔ حضرت علیؓ فرماتے تھے کہ میں نے کسی عرب سے کوئی نادر کلمہ یا ترکیب لفظی سنی ہے' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے سنی ہے۔ میں نے آپؐ کو کہتے سنا: "**مات حتف انفہ**" میں نے آپؐ سے پہلے کسی عرب سے یہ ترکیب نہیں سنی۔ رافعی نے کہا ہے کہ اس کے معانی عموماً بستر پر مرنے کے لیے جاتے ہیں۔ صاحبِ قاموس کا کہنا ہے کہ عربوں کا عقیدہ تھا کہ رُوح ناک سے نکلتی ہے' سوائے اس کے کہ موت زخم سے واقع ہو۔ اس صورت میں رُوح' زخم سے نکلتی ہے۔ کسی کی رُوح' ناک سے نکلی' گویا وہ بستر پر مرا' یعنی "طبعی" یا غیر حادثاتی موت۔ رافعی کہتے ہیں کہ اس کی ایک دوسری تعبیر بھی ممکن ہے۔ "حتف" ہلاکت کو کہتے ہیں۔ کسی شخص کا ناک کی موت مرنا گویا اس کی عزت و آبرو کا مرجانا ہے کہ ناک سے عزت و آبرو کی تعبیر کی جاتی ہے۔ موت نے اس کی ناک اس کی قوم میں اونچی نہ ہونے دی' گویا ذلت کی موت مرا۔۸

اسی طرح جنگ کے بارے میں آپؐ کا قول "**الآن حمی الوطیس**" (اب تنور گرم ہو گیا' یا ابو تمیم الہجیمی سے فرمانا: **ایاک و المخیلۃ**" بعض صحابہؓ نے عرض کیا' یا رسول اللہ! ہم عرب لوگ ہیں (اور زبان پر عبور رکھتے ہیں)' یہ مخیلہ کیا ہے؟ فرمایا: "**سبل الازار**" (پاجامے کا نیچے تک لٹکانا)۔ اس کے بعد یہ کلمہ مروج ہو گیا' اور اس سے تکبر اور بڑائی کا اظہار مراد لیا جانے لگا۔۹

اسی طرح قاضی عیاض نے جہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی فصاحتِ لسان اور بلاغتِ کلام کی تحسین کی ہے' اور بتایا ہے کہ آپؐ کی گفتگو ایسے فصیح اور واضح الفاظ میں ہوتی تھی' جن میں نہ تنافر ہوتا تھا' نہ ناماتوسیت' کلام میں نہ کہیں جھول نظر آتا تھا' اور نہ تکلف اور تصنع' وہیں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ آپؐ نے اپنے ہم عصروں

سے الگ ایک دل کش اندازِ کلام ایجاد کیا۔ آغازِ گفتگو کا نیا انداز' خطبہ کا ایک جدید اسلوب اور مافی الضمیر اور مقصدِ گفتگو کا موثر انداز میں اظہار' آپؐ کو اپنے تمام پیش رو ادیبوں اور خطیبوں سے ممتاز کرتا ہے۔۱۰۔

حوالے

۱۔ احمد زیات' حوالہ مذکورہ بالا' ص ۱۶۰

۲۔ رافعی' اعجاز القرآن و بلاغتہ النبویتہ' ص ۳۱۵ - ۳۱۷

۳۔ تاریخ افکار و علوم اسلامی (ترجمہ الثقافتہ الاسلامیتہ)' لاہور' ص ۳۵۲

۴۔ رافعی' ایضاً' ص ۳۲۵ تا ۳۲۷' نیز ص ۳۳۳۔

۵۔ ایضاً' ص' ۳۴۹ - ۳۵۰ - عربی اگرچہ تمام قبائل کی زبان تھی' تاہم مختلف علاقوں اور قبائل کی بولیوں میں بڑا فرق تھا (اور اب بھی ہے) آپؐ کے کلام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ جب باہر سے آنے والوں سے گفتگو فرماتے تو بہت سے ایسے غریب الفاظ بے ساختہ استعمال فرماتے' جو قریش اور اہل حجاز کے ہاں مروج نہ تھے' لیکن مخاطبین کی زبان میں مستعمل تھے۔ اس سلسلے میں آپ کی وہ گفتگو مشہور ہے' جو آپؐ نے طہیہ بن ابی زہیر ہندی (تاریخ الادب العربی میں یہ نام طہفہ ہے۔ ترجمہ ص ۱۷۶' نیز عیاض: الشفاء' مطبع صدیقی بریلوی' ص ۳۴' اور لقیط بن عامر بن منتفق کے ساتھ کی۔
علامہ رافعی کہتے ہیں کہ ان صحابی کے نام کو مختلف لوگوں نے مختلف ہجوں سے لکھا ہے' لیکن صحیح طہفہ ہی ہے (اعجاز القرآن' ص ۳۵۰۔)

۶۔ ایضاً' ص ۳۱۳

۷۔ رافعی' ایضاً' ص ۳۱۴

۸۔ رافعی' اعجاز القرآن' و بلاغتہ النبویتہ ص ۳۴۷ - ۳۴۸

۹۔ ایضاً' ص ۳۴۸' نیز ۳۴۹

۱۰۔ تاریخ افکار و علوم اسلامی' حوالہ سابق' ص ۳۵۲' قاضی عیاض' الشفاء' مطبع صدیقی بریلی' ص ۳۶-۳۵' نیز ۲۶ - ۱۲۵

شیخ محبوب علی مرحوم

حافظ محمد ادریس

شیخ محبوب علی جماعت اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ کے رکن' اور ضلع شرقی کراچی کے امیر تھے۔ ۶۴-۱۹۶۲ میں وہ اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے ناظم اعلیٰ بھی رہے۔ وہ ۱۹۹۳ کے ماہ اپریل میں ہم سے رخصت ہو کر خالق حقیقی سے جا ملے۔ زیرنظر مضمون شیخ صاحب مرحوم کے ساتھی' حافظ محمد ادریس' امیر جماعت اسلامی صوبہ پنجاب نے خاص "ترجمان القرآن" کے لیے لکھا ہے۔

۹ اپریل ۱۹۹۳ کو شیخ محبوب علی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ شیخ محبوب علی بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ انھوں نے پوری زندگی اللہ کے دین کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ ان کے ساتھ میرا تحریکی تعلق کم و بیش تیس سالوں پر محیط ہے۔ ان کا نام پہلی مرتبہ ستمبر ۱۹۶۳ میں سنا تھا۔ میں اپنے گاؤں سے نیا نیا لاہور آیا تھا اور اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں سال اوّل کا طالب علم تھا۔ اسلامی جمعیت طلبہ سے کسی حد تک ہائی سکول میں متعارف ہو چکا تھا۔ یہاں آکر جمعیت کے بعض رفقا سے ملاقات ہوئی تو پتا چلا کہ جمعیت کا دفتر پھول بلڈنگ' گوالمنڈی میں واقع ہے۔ پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ ٹولنٹن مارکیٹ انارکلی کی ایک مسجد میں اتوار کے دن جمعیت کا اجتماع ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک اتوار کو میں ٹولنٹن مارکیٹ پہنچا۔

اس اجتماع میں ناظم اعلیٰ کے دورۂ لاہور کا بھی تذکرہ ہوا۔ بتایا گیا کہ ناظم اعلیٰ' شیخ محبوب علی' شمال مغربی پاکستان کے دورہ پر تشریف لا رہے ہیں۔ ناظم اعلیٰ کے دورے کا پروگرام سن کر اشتیاق پیدا ہوا کہ ان کی آمد پر ان سے ملاقات کی جائے۔ حسب پروگرام ناظم اعلیٰ تشریف لائے اور ان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے موٹے شیشوں کا چشمہ لگا رکھا تھا اور پان کھا رہے تھے۔ پہلی ملاقات میں میں ان سے کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوا تھا۔ مگر بعد میں وقت گزرنے کے ساتھ جوں جوں ان سے قریبی رابطہ اور گہرا تعلق قائم ہوتا گیا ان کی شخصیت کی عظمت میرے

دل و دماغ پر نقش ہوتی چلی گئی۔

شیخ محبوب علی گوالیار (بھارت) میں ۱۹ جون ۱۹۴۳ کو پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۹ میں ہجرت کر کے پاکستان آگئے۔ اس وقت ان کی تعلیم نمل تھی۔ ۱۹۵۴ میں میٹرک، اور ۱۹۵۶ میں سندھ مسلم آرٹس کالج سے ایف اے کا امتحان پاس کیا۔ شیخ صاحب نے کراچی یونیورسٹی میں بی اے آنرز میں داخلہ لیا، مگر تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ ۱۹۶۶ میں پرائیویٹ طالب علم کی حیثیت سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد شیخ صاحب پی ایس او میں ملازم ہوگئے جہاں اپنی وفات تک اکاؤنٹنٹ آفیسر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ وہ اگر چاہتے تو ان صلاحیتوں کے مالک تھے کہ معروف دنیاوی لحاظ سے نہایت اعلیٰ مقام حاصل کرسکتے تھے۔ لیکن انھوں نے تحریک کو اپنا کیریئر بنایا۔ تحریک کے تقاضوں کے تحت انھوں نے اپنی دنیا قربان کی اور دوستوں تک سے بہت کچھ سنتے رہے۔ وہ کبھی کُل وقتی نہ رہے لیکن ہمیشہ کُل وقت سے زیادہ ہی دیتے محسوس ہوتے۔

بچپن میں شیخ صاحب کے گھر کا ماحول روایتی انداز میں کچھ زیادہ مذہبی نہیں تھا۔ خاندان کے اکثر لوگ جدید تعلیم یافتہ تھے اور معاشی لحاظ سے بھی کھاتے پیتے گھرانوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ شیخ صاحب کے بقول گھر میں مغربی موسیقی کی دھنیں سنائی دیتی تھیں اور مختلف آلات موسیقی بھی پائے جاتے تھے۔ اسلامی جمعیت طلبہ کے کارکنوں نے شیخ صاحب پر ڈورے ڈالنا چاہے تو انھیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ شیخ صاحب جس ماحول میں رہتے تھے اس میں مولانا مودودیؒ کو پاکستان کا مخالف اور غدّارِ ملک و قوم بنا کر پیش کیا جاتا تھا۔ اسلامی جمعیت طلبہ، جماعتِ اسلامی کی ذیلی تنظیم سمجھی جاتی تھی۔ اس لیے شیخ صاحب دعوت سن کر پہلے تو بدکے اور پھر بپھر گئے۔ جمعیت والوں سے کہا "تم مودودی کے مرید ہو اور مودودی غدّار ہے۔"

لگن اور خلوص سے کام کرنے والے کارکنان پتھر کو بھی پانی بنا دیتے ہیں، مسلسل اور سنجیدہ کوشش سے لوہا بھی موم ہو جاتا ہے۔ شیخ محبوب علی صاحب کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ جس رفیق نے شیخ صاحب کو ہدف بنا رکھا تھا، (یہ عبداللہ جعفر صدیقی تھے)، وہ حکمت کے ساتھ انھیں دعوت پہنچاتے رہے، تاآنکہ شیخ صاحب اجتماعات میں بھی شریک ہونے لگے اور لٹریچر کا مطالعہ بھی شروع کردیا۔ شیخ صاحب نے سب سے پہلے مولانا مودودی صاحب کی کتاب "تنقیحات" پڑھی جس نے ان کا ذہن بدل ڈالا۔ شیخ صاحب کراچی میں پیر الٰہی بخش کالونی میں رہتے تھے۔ اس وقت کے ناظم اعلیٰ خرّم مُراد بھی وہیں رہتے تھے۔ شیخ صاحب کے بقول "خرم مراد صاحب نے ان کی ذہنی تربیت میں بہت اہم کردار ادا کیا۔" سکول کی طالب علمی کے دوران

ہی شیخ صاحب کو جمعیت کا رکن بنایا گیا' اور پھر پورے کراچی کے حلقہ مدارس کی ذمہ داری ان پر ڈال دی گئی۔ اس زمانے میں ڈاکٹر محمد عمر چھاپرا کراچی جمعیت کے ناظم تھے جبکہ ناظم اعلیٰ پروفیسر خورشید احمد صاحب تھے۔ شیخ صاحب ۱۹۵۷ میں کراچی جمعیت کے ناظم منتخب ہوئے۔ مارشل لا کی پابندی کے بعد' جون ۱۹۶۲ میں جمعیت بحال ہوئی' تو دسمبر میں پہلے انتخاب میں انھیں ناظم اعلیٰ منتخب کرلیا گیا۔ اگلے سال اکتوبر ۱۹۶۳ میں' جمعیت کے بارہویں سالانہ اجتماع منعقدہ کراچی میں شیخ محبوب علی کو دوسری مرتبہ ارکان نے نظامتِ اعلیٰ کی ذمہ داری سونپ دی۔ ۱۹۶۶ کے آغاز میں وہ جماعت کے رکن بن گئے۔ انتقال کے وقت وہ ضلع شرقی کے امیر تھے۔ مبالغہ نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ کارکن ان پر جان چھڑکتے تھے' لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ان کی نظروں میں کارکنوں کا مقام نہایت بلند تھا۔ حقیقی معنوں میں قائد تھے۔ اللہ نے انھیں اور زندگی دی ہوتی تو تحریک کو ان سے بہت کچھ ملتا۔

شیخ محبوب علی صاحب کے دونوں چھوٹے بھائی محمود علی اور مقصود علی جمعیت کے رکن رہے۔ اوّل الذکر تو کراچی کے ناظم اور مرکزی شوریٰ کے رکن بھی رہے' جبکہ مؤخر الذکر کراچی کی مقامی شوریٰ کے رکن رہے۔ ان کے تمام اہلِ خانہ نہ صرف تحریک سے وابستہ ہیں بلکہ اہم ذمہ داریوں پر بھی فائز ہیں۔ مرحوم کی چھ بیٹیاں اور تین بیٹے ہیں۔ ایک بیٹی اسلامی جمعیت طالبات کراچی شہر کی ناظمہ اور مرکزی مجلس شوریٰ کی رکن ہے' جبکہ دوسری جامعہ کراچی کی ناظمہ ہے۔ مرحوم کی بیوہ حلقہ خواتین جماعت اسلامی کراچی ضلع شرقی کے ایک مقامی حلقے کی ناظمہ ہیں۔ ان کا بڑا بیٹا ان کی وفات کے وقت میٹرک پاس کرچکا تھا اور جمعیت کا رفیق تھا' کچھ عرصے بعد اس سے ملاقات ہوئی تو وہ امیدوار رکنیت تھا۔ جب تعارف ہوا تو مجھے اپنے محترم بھائی شیخ محبوب علی بہت شدت سے یاد آئے۔ میں نے اپنے عزیز بھتیجے کو شفقت اور پیار سے اپنے ساتھ چمٹا لیا اور دل سے اس کے لیے دعائیں نکلیں۔ اللہ تعالیٰ اسے اپنے باپ کی طرح اپنے دین کا سچا سپاہی بنائے۔ اس کے باپ کے ہم پر بڑے احسانات ہیں کہ انھوں نے ہماری تربیت میں قابلِ قدر خدمات سرانجام دیں۔

اپنے زمانہ طالب علمی میں ایک کارکن کی حیثیت سے میں نے شیخ محبوب علی صاحب کو بہت مشفق' مربّی' ہمدرد دوست اور خوش اخلاق ساتھی پایا۔ وہ بہت تیز گفتگو کیا کرتے تھے' مگر جس موضوع پر انھیں خطاب کرنا ہوتا اس کا حق ادا کردیتے تھے۔ جب کبھی لاہور آتے ہم سے بہت سینئر ہونے کے باوجود یوں گھُل مِل جایا کرتے جیسے بچپن کے ہم جولی ہوں۔ شستہ مزاح اور

مہذب انداز میں فقرے چست کرنا' پان کی طرح ان کی شخصیت کا لازمی حصہ تھا۔ جمعیت کے دفتر میں تشریف لاتے تو ہمارے ساتھ بالکل بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے۔ انارکلی بازار میں پیدل چلنا' ہوٹل میں اکٹھے کھانا کھانا' راستے میں کسی کھوکھے سے ان کا پان لینا اور ہم میں سے اکثر ساتھیوں کا محض الائچی اور سونف سے شوق پورا کرنا' طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود آج بھی ہر چیز ذہن میں یوں محفوظ ہے جیسے کل کی بات ہو۔

جب میں لاہور جمعیت کا ناظم بنا اور مرکزی شوریٰ میں بھی منتخب ہوگیا تو پہلی مرتبہ کراچی جانے کا اتفاق ہوا۔ شیخ محبوب علی جماعت اسلامی کے دفتر واقع آرام باغ میں اتنی اپنائیت اور محبت سے ملے کہ اہل کراچی کے بارے میں باہر سے آنے والوں کو عموماً جو شکوہ ہوتا تھا وہ غلط ثابت ہوا۔ شیخ صاحب تنظیمی معاملات میں بھی رہنمائی دیتے رہتے تھے مگر نشرواشاعت ان کا خاص میدانِ عمل اور موضوعِ سخن تھا۔ جماعت میں آنے کے بعد بھی میں نے دیکھا کہ شیخ صاحب مرحوم نشرواشاعت کی کمیٹیوں میں مفید مشورے اور تجاویز پیش کیا کرتے تھے۔

میں نے شیخ محبوب علی مرحوم کو جماعت کی مرکزی مجلسِ شوریٰ میں بہت قریب سے دیکھا' وہ ہر مقرر کی گفتگو بڑی توجہ اور غور سے سنا کرتے تھے۔ عموماً وہ نوٹس بھی لیا کرتے تھے۔ موضوع زیرِبحث پر عموماً دھیمی آواز مگر اپنے معمول کے مطابق تیز گفتاری سے اپنے خیالات کا اظہار فرماتے۔ بعض مواقع پر موضوع کی مناسبت اور شوریٰ کے ماحول کے مطابق جذباتی تقریر بھی کیا کرتے تھے۔ ایسے مواقع پر یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی شُعلہ نوا خطیب کسی جلسہ عام سے خطاب کررہا ہو مگر ایسے مواقع کبھی شاذونادر ہی دیکھنے میں آتے تھے۔

بیرونِ ملک سے وطن واپس آنے کے بعد مجھے مرکز میں نائب قیم کی ذمہ داری سونپی گئی تو کراچی کے ہر دَورے کے موقع پر شیخ صاحب خصوصی طور پر ملاقات کے لیے وقت نکالتے اور نہایت مشفقانہ اُخوت کا مظاہرہ فرماتے۔ جب شیخ صاحب ضلع شرقی کے امیر منتخب ہوئے تو انھوں نے پچیس دسمبر کو اپنے ضلع کی عمومی تربیت گاہ منعقد کی۔ اس تربیت گاہ کے لیے کافی عرصہ پہلے انھوں نے مجھے پابند کیا۔ یہ پروگرام اب ہر سال باقاعدگی سے منعقد ہوتا ہے' اور شرقی کے علاوہ دیگر اضلاع بھی اس موقع پر اپنی اپنی تربیت گاہوں کا اہتمام کرتے ہیں۔ دسمبر ۱۹۹۳ میں جب میں ان پروگراموں کے لیے کراچی پہنچا تو مجھے اپنے مرحوم بھائی شیخ محبوب علی بڑی شدت سے یاد آئے۔ میں نے سوچا کہ اس تربیتی پروگرام کی طرح نہ جانے کتنی باتوں میں شیخ محبوب علی صاحب کو سبقت کا اعزاز حاصل ہے۔

میں نے حسن البنا شہید کے احوال جب بھی پڑھے ہیں ان سے متاثر ہوا ہوں۔ امام شہید بہت بڑے مُصلح اور مربّی تھے۔ ان کی ایک ادا مجھے بہت ہی اچھی لگتی ہے۔ ان کے ساتھیوں نے کئی مقامات پر تذکرہ کیا ہے کہ امام بہت اچھے مقرر اور شعلہ نوا خطیب تھے۔ جس موضوع پر گفتگو کرنا ہوتی اس کی خوب تیاری بھی کرتے تھے اور ان کے خطابات سے حاضرین ہمیشہ متاثر ہو کر جایا کرتے تھے۔ اس کے باوجود حسن البنا شہید کی عادت تھی کہ پروگرام سے فارغ ہو کر اپنے معتمد ساتھیوں سے اپنے خطاب پر تنقیدی تبصرہ کرنے کی فرمائش کرتے۔ سچی بات یہ ہے کہ اس کلیہ پر عمل سے بڑا فائدہ ہوتا ہے۔

میں نے اپنے جماعتی ساتھیوں میں سب سے زیادہ شیخ محبوب علی مرحوم میں یہ خوبی پائی ہے۔ وہ اپنے ضلع کے تربیتی پروگراموں میں موضوعات طے کرتے وقت مربّی حضرات کو ضروری نکات بھی لکھ دیا کرتے تھے اور پروگراموں کے بعد ان پر متعلقہ مربّیین سے تبادلۂ خیالات بھی کیا کرتے تھے۔ اس تبادلۂ خیال کو میں نے از حد مفید پایا ہے۔ شیخ محبوب علی مرحوم خود جب کبھی کوئی پروگرام پیش کرتے تو باقاعدہ اس کی تیاری کرتے' نوٹس بناتے اور تقریر کے بعد انھیں کسی نکتے کے بارے میں متوجہ کیا جاتا تو بہت ممنون ہوتے۔ وہ اپنی نوعیت کے منفرد مربّی تھے۔ اللہ تعالیٰ انھیں غریقِ رحمت کرے۔ ان کے تربیت یافتہ نوجوان ہر جگہ مل جاتے ہیں۔

شیخ محبوب علی بظاہر کم گو اور غیر متعلق سے انسان نظر آتے تھے مگر فی الحقیقت وہ بہت پیارے ساتھی' محبت کرنے والے دوست اور خوشی و غم میں شریک رہنے والے بھائی تھے۔ چند سال قبل میرے بیٹے داؤد ادریس کو اچانک اعصابی اور ذہنی تکلیف شروع ہوگئی جو کافی عرصے تک خاصی پریشانی کا باعث رہی۔ اس عرصے میں مَیں نے دیکھا کہ تمام تحریکی احباب میرے اس تفکر و حزن میں برابر شریک رہے۔ اس عرصے میں جناب شیخ محبوب علی مرحوم نے دوستی کا حق ادا کیا۔ ایک مرتبہ انھوں نے بہت اصرار کیا کہ میں داؤد میاں کو ساتھ لے کر کراچی آؤں اور ڈاکٹر مبین اختر صاحب سے مشورہ اور علاج کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ شیخ صاحب کو میں نے بتایا کہ علاج ہو رہا ہے اور اللہ کے فضل سے کارگر ہے۔ شیخ صاحب نے زور دے کر کہا کہ وہ پی آئی اے کا میرا اور داؤد میاں کا ٹکٹ بھجوا دیں گے' مگر میں نے بڑی مشکل سے ان کو قائل کیا کہ اس سفر کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ داؤد میاں کے صحت یاب ہونے پر جملہ احباب میری خوشی میں شریک تھے۔ شیخ محبوب علی ہر ملاقات پر احوال معلوم کرتے اور اس خوشی کا اظہار اور اللہ کا شکر ادا کرتے۔ انسان کی یہ چھوٹی چھوٹی باتیں فی الحقیقت اس کی عظمت کا پتا

دیتی ہیں اور یادگار رہتی ہیں۔

اتفاق کی بات ہے کہ شیخ محبوب علی مرحوم کی وفات کی اطلاع بھی گھر میں فون پر سب سے پہلے داؤد میاں ہی نے سنی۔ پہلے تو ہمیں یقین ہی نہ آیا مگر جب تحقیق ہوئی تو پتا چلا کہ یہ اندوہناک خبر درست تھی۔

اسلامی جمعیت طلبہ کے قائد کے طور پر شیخ محبوب علی مرحوم نے ملک کے طول و عرض میں بے شمار دورے کیے اور بے شمار طلبہ کو جمعیت کے ساتھ وابستہ کرنے میں کامیاب رہے۔ اس عرصے میں حکومتی مشینری کئی بار ان کے آڑے آئی مگر شیخ صاحب کے عزمِ بلند کے سامنے کوئی چیز رکاوٹ نہ بن سکی۔ مشرقی پاکستان میں ایک لاکھ طلبہ عربیہ کے تاریخی جلوس کی قیادت ان کے دور کا ایک یادگار واقعہ ہے جس کے نتیجے میں انھیں قیدوبند کی منزلوں سے بھی گزرنا پڑا اور مختلف قسم کی دھمکیوں سے بھی انھیں مرعوب کرنے کی ناکام کوشش کی گئی۔ شیخ صاحب درویش منش انسان تھے' سادگی اور قناعت ان کا طرہ امتیاز تھا۔ وہ اسلاف کی تصویر تھے جو تحریص اور تخویف کے کسی حربے سے زیرِدام نہیں لائے جاسکتے تھے۔

شیخ صاحب بہت جفاکش اور محنتی انسان تھے۔ بعض جمعیتی ساتھیوں نے ان کے بارے میں بیان کیا کہ کسی سالانہ اجتماع کے موقع پر بے پناہ مصروفیات کی وجہ سے ناشتے کا موقع نہ مل سکا۔ علی الصبح کاموں میں مصروف ہوئے تو دوپہر ہوگئی۔ کسی ساتھی نے ناشتہ نہ کرنے کا تذکرہ کیا تو شیخ صاحب نے اپنے مخصوص لہجے میں مسکراتے ہوئے فرمایا "میں نے صبح ہیوی پان کھا لیا تھا' ناشتے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ بس اب دوپہر کا کھانا کھائیں گے۔"

شیخ محبوب علی مرحوم زمانہ طالب علمی ہی سے انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں اچھا لکھتے تھے' مگر افسوس ہے کہ انھوں نے تصنیف و تالیف کے میدان میں زیادہ دلچسپی نہ لی ورنہ وہ اپنے پیچھے قابلِ قدر اور مفید یادگاریں چھوڑ جاتے۔ جمعیت کا رسالہ "ہمقدم" اللہ کے فضل سے اب میدان صحافت میں اپنا مقام پیدا کرچکا ہے۔ مجلّہ ہمقدم کی پُرشکوہ عمارت کی بنیاد میں پہلی اینٹیں شیخ محبوب علی مرحوم ہی نے رکھی تھیں۔ کافی عرصہ تک یہ رسالہ سائیکلو سٹائل کرکے نشر کیا جاتا تھا۔ جمعیت کا انگریزی پرچہ "اسٹوڈنٹس وائس" بھی طلبہ برادری میں ایک ممتاز مقام رکھتا تھا۔ شیخ محبوب علی اس کے ادارتی بورڈ کے صدر بھی رہے۔

شیخ محبوب علی اکثر و بیشتر کام خاموشی سے سرانجام دیا کرتے تھے۔ اپنا یہ معمول انھوں نے آخری دم تک خوب نبھایا' حتیٰ کہ سفرِ آخرت پر بھی وہ ایسی خاموشی سے روانہ ہوئے کہ کسی کو

کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ شیخ صاحب جس فلیٹ میں رہتے تھے وہ ایک بلند و بالا عمارت کی چھٹی منزل پر تھا۔ شیخ صاحب کو کبھی کبھار انجائنا کی تکلیف محسوس ہوتی تھی۔ شیخ صاحب کی ایک سالی کی شادی ہو رہی تھی جس میں تمام اہل خانہ کو شرکت کرنا تھی۔ شادی سے ایک روز قبل آپ کے بیوی بچے ننھیال چلے گئے۔ شیخ صاحب انھیں چھوڑ کر جماعت کے ایک پروگرام کے لیے روانہ ہوگئے۔ نکاح کی تقریب میں شیخ صاحب تشریف نہ لائے تو ان کے بارے میں تشویش لاحق ہوئی۔ رات کو شیخ صاحب گھر میں تنہا تھے۔ پتا نہیں کس وقت انھیں بلاوا آیا اور وہ اپنے رب کے ہاں حاضر ہوگئے۔ گھر والے ان کی تلاش میں آئے تو انھیں گھر میں جاں بحق پایا۔ یوں خوشی کا موقع غم کے تاریک سایوں میں ڈوب گیا۔ پورے ملک میں یہ خبر تحریکی ساتھیوں پر بجلی بن کر گری۔ وہ جو سب کے غم اور خوشیوں میں شریک رہتا تھا کسی کو اپنا غم اور دکھ بتائے بغیر چپ چاپ دکھوں بھری دنیا سے گہوارۂ امن میں منتقل ہوگیا۔ خدائے بزرگ و برتر اس کی قبر کو نور سے بھر دے کہ اس نے بے شمار تاریک زندگیوں کو نورِ ربانی سے منور کیا تھا۔

کتاب نما

وجدانِ سلیم: از میرزا خادم ہوشیارپوری۔ ناشر: دارالاشاعت ادارۂ تنظیم مساجد، ٹیلیفون ٹاؤن، گوجرانوالہ۔ بڑے قرآنی سائز کے تقریباً ۵۰۰ صفحات۔ ہدیہ نامعلوم۔

یہ مبارک کتاب قرآن پاک کی منظوم ترجمانی ہے اور سلسلے کی پہلی جلد پارۂ اول تا دہم پر مشتمل ہے۔ ایسی دو جلدیں اور متوقع ہیں۔

میرزا صاحب کے ذہن سے ۱۹۵۱-۵۲ میں سورۂ فاتحہ کا منظوم ترجمہ صادر ہوا۔ پھر دورِ قطرۂ سخن طاری ہوا۔ تاآنکہ اس رجحان نے ۱۹۸۴ میں کروٹ لی۔ پھر وہ وقتاً فوقتاً مختلف سور و رکوعات کا ترجمہ کرتے رہے۔ ایسے بھاری بھرکم کام کے لیے ان کو متعدد مخیر حضرات کا تعاون حاصل ہوا۔ اب "وجدانِ سلیم" کی جلد اوّل سامنے آئی ہے۔ پیش لفظ میں حکیم مولینا محمد شریف درانی نے ان کی منظوم خدمت کا جائزہ لیا ہے اور اچھی رائے دی ہے۔ بہت سے اقتباسات انہوں نے جمع کر کے بحث کی ہے۔

یہ حقیقت اپنی جگہ برحق کہ قرآنِ کے بارے میں خدا نے صاف بتا دیا کہ ہم نے اپنے بندے پر شعر نازل نہیں کیے۔ "وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ" اس تنزیہ کے ساتھ یہ امر بھی ثابت ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابی شاعروں سے شعر کہلوائے، اور دوسرے صحابیوں کو سنوائے، اور تعریف کی۔ قرآن کے منظوم ترجمے کا جواز تو ہو سکتا ہے، مگر میں نے جتنے منظوم ترجمے دیکھے ہیں، وہ ایک تو قرآن کی ترجمانی سے قاصر رہ جاتے ہیں، دوسرے بھرتی کے نامانوس الفاظ لانے سے ان کا حسن بھی مٹ جاتا ہے۔

میرزا خادم صاحب نے نہ صرف پہلی مرتبہ حفیظ کے شاہنامے والی بحر اختیار کی ہے بلکہ اشعار بھرتی کے نہیں، پرلطف معلوم ہوتے ہیں۔ میرزا صاحب نے بعض امکانی خطرات کا سدِباب کرنے کے لیے الفاظِ قرآنی کا الگ الگ واضح ترجمہ بھی دیا ہے اور بامحاورہ بھی۔ یہ واضح نہیں کہ تراجم کن کن بزرگوں کے ہیں۔ اب چند اشعار مختلف مقامات سے

سورۂ فاتحہ کے دو تین شعر۔

خدایا صرف تیری ہی عبادت ہم تو کرتے ہیں
تجھی سے طالبِ نصرت ہیں اے، دم تیرا ہی بھرتے ہیں
دکھا ہم کو تو سیدھی راہ ان مقبول بندوں کی
رضا کے آرزو مندوں، وفا کے درد مندوں کی
جنہیں تو نے نوازش ہائے پیہم سے نوازا ہے
ترا ابرِ عنایات مسلسل جن پہ برسا ہے

سورۂ بقرہ میں منافقین کا ذکر۔

کچھ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں
عقیدت مند بن کر خدمتِ نبویؐ میں آئے ہیں
غلط ہے ادعا ان کا، وہ کب ایمان لائے ہیں
فریب اللہ کو اور مومنوں کو دینے آئے ہیں
یہ ان کی خود فریبی ہے، یہ ان کی کج ادائی ہے
کبھی اس طرح بھی راہِ ہدایت ہاتھ آئی ہے

سورۂ آلِ عمران آیت ۱۴۔

یہ مال، اولاد، بیوی، سونا چاندی، اسپ تازی بھی
مویشی، کشت کاری، باغ و نخلستاں، اراضی بھی
کشش ہے ان میں، بے شک خوشنما بھی، دلربا بھی ہیں
مگر اللہ کے انعام، بہتر بھی، سوا بھی ہیں

(نعیم صدیقی)

جہاتِ اقبال: از ڈاکٹر تحسین فراقی۔ ناشر: بزم اقبال، ۲ کلب روڈ، لاہور۔ صفحات ۲۳۸۔ قیمت ۱۰۰ روپے۔

زیرِ نظر کتاب، اقبالیات پر ڈاکٹر تحسین فراقی کے نو تحقیقی و تنقیدی اور تجزیاتی مضامین کا مجموعہ ہے۔ موصوف پنجاب یونیورسٹی میں اردو زبان و ادب کے معلم ہیں اور ملک کے ادبی حلقوں میں ایک ممتاز دانش ور، نقاد اور شاعر کے طور پر بخوبی متعارف ہیں۔

۱۔ لفظ نصرت استعانت کا مفہوم نہیں دیتا۔

اس مجموعے کا پہلا مضمون اس طرح شروع ہوتا ہے:

"علامہ اقبال ہمارے ایسے نابغہ عصر شاعر تھے جو خدا' انسان اور کائنات تینوں کا ایک مخصوص اور متوازن شعور رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک زندگی ایک بامعنی سرگرمی ہے جو جہانِ تازہ اور امتحانِ تازہ سے عبارت ہے۔ خدا کی ذات ایک ایسی قابلِ ستایش ہستی ہے' جو ہمہ وقت اپنی مخلوقات پر نظر رکھتی ہے اور ان سے الگ تھلگ یا لاتعلق نہیں ہے' اور انسان ایک ایسی جواب دہ مخلوق ہے' جس کے کندھوں پر خلافتِ ارضی کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے۔ یہی وہ مرکزی خیالات و تصورات ہیں' جو نئے سے نئے اور منفرد سے منفرد اسلوب میں ان کی شاعری میں بالخصوص اور ان کی نثر میں بالعموم جگہ پاتے ہیں۔"

اقبال کی شاعری اور فکر کی گوناگوں اور مختلف' بلکہ بعض اوقات متضاد تعبیریں کی جاتی ہیں۔ ڈاکٹر فراقی نے درجِ بالا سطور میں علامہ اقبال کی حقیقی فکری جہت کو مناسب الفاظ اور متوازن و موثر انداز میں واضح کیا ہے --- اس اقتباس سے خود مصنف کے زاویہ نظر اور اسلوبِ تنقید کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

تنقیدی مضامین میں "جمہوریت' اقبال کی نگاہ میں" مجموعے کا ایک سیر حاصل اور بھرپور مضمون ہے۔ مصنف کا یہ کہنا بجا ہے کہ اقبال' جمہوریت کے جس قدر مداح ہیں' اس سے کہیں زیادہ اس کے نقاد ہیں۔ ان کی تحریریں شاہد ہیں کہ اوائل میں انھوں نے جمہوریت کو بہترین طرزِ حکومت قرار دیا' اور برطانیہ کی جمہوریت پسندی کے مداح رہے' لیکن جب "بندوں کو گنا کرتے ہیں' تولا نہیں کرتے" پر مبنی طرزِ حکومت کی خرابیاں ان پر واضح ہوئیں تو وہ اس کے شدید ناقد بن گئے۔ جمہوریت کے باب میں اقبال کے ہاں جو تضاد محسوس ہوتا ہے' فراقی صاحب نے اس کی وضاحت بایں الفاظ کی ہے: "اقبال جمہوریت کی روح یعنی حریتِ فکروعمل (بحیثیت ایک اصول) کے تو قائل ہیں' مگر اس کے عملی مغربی مظاہر کے نقاد" --- شاید امرواقعہ بھی یہی ہے۔

"عصری مسائل اور فکر اقبال" میں مصنف بتاتے ہیں کہ اقبال نے اپنے عہد کے فکری' فلسفیانہ اور روحانی مسائل کو ایک حکیم اور دانش ور کی نگاہ سے دیکھا اور ان پر فنکارانہ ردعمل ظاہر کیا' اور وہ تھا: "ایک سچے مسلم کی طرح قرآن و سنت اور حکمتِ بالغہ کی روشنی میں' ان کا تجزیہ کرکے نسخہ شفا" کی تجویز --- "علامہ اقبال اور مسلم نشاتِ ثانیہ" ایک اور قابل قدر مضمون ہے۔

تحقیقی حصے میں ڈاکٹر فراقی نے شیخ عطاء اللہ مرحوم کے مرتبہ مجموعۂ مکاتیب "اقبال نامہ" کی فروگزاشتوں پر عالمانہ گرفت کی ہے۔ بحیثیت مجموعی، وہ اقبال کے محققین و مرتبین کی تعجیل پسندی اور سہل انگاری اور اشاعتی اداروں کی ہوسِ نفع اندوزی پر شکوہ کناں ہیں، کیونکہ اس کے نتیجے میں صورتِ حال اس حد تک تشویش ناک ہو چکی ہے کہ "لفظ غلط" معنی غلط اور اِملا و انشا غلط" اور اس کی بنیاد پر مرتبہ نتائج بھی غلط" --- اس مضمون کے ساتھ ڈاکٹر فراقی نے "اقبال نامہ" کے سات مکاتیب کو صحتِ متن اور حواشی و تعلیقات کے ساتھ مرتب کرکے تدوینِ خطوط کا ایک معیاری نمونہ بھی فراہم کیا ہے --- انھوں نے مقبول انور داؤدی کی کتاب "مطالبِ اقبال" کو بھی اسی دقتِ نظر سے دیکھا ہے اور اس کی خامیوں، غلطیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی کرنے کے بعد، بجا طور پر قرار دیا ہے کہ: "اقبال آج بھی مظلوم ہیں" --- اقبالیاتی ادب کے تجزیے پر ۴۹ صفحاتی مفصل مقالہ "جلوہ خوں گشت و نگاہے بتماشا نرسید" اس تاثر کو مزید شدت کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ فراقی صاحب اقبالیاتی تنقید سے قطعاً" مطمئن نہیں کیونکہ اس میں پھیلاؤ تو ہے مگر عمق، وسعت اور گہرائی نہیں ہے۔ ان کے اس (قدرے مایوسانہ ؟) نقطۂ نظر سے، کتاب کے دیباچہ نگار محترم میرزا ادیب نے اختلاف کیا ہے۔ فراقی صاحب کی اس رائے کو پوری طرح تسلیم کرنے میں ہمیں بھی تامل ہے، تاہم اس میں اختلاف نہیں کہ اقبال کو ایک "بڑے اور جیّد نقاد" کی ضرورت ہے، اور "اقبال کو مجاورین کی نہیں، مجاہدین اور پوئٹک وژن رکھنے والے مجتہدین کی ضرورت ہے۔"

اقبالیات پر ایک محتاط اندازے کے مطابق ہر سال ۲۰، ۲۵ کتابیں چھپتی ہیں، مگر قابلِ لحاظ کتابوں کی تعداد ۴، ۵ سے زیادہ نہیں ہوتی (کبھی اس سے بھی کم)۔ "جہاتِ اقبال" اس موضوع کی منتخب کتابوں میں شمار ہونے کے لائق ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی کا اسلوب، نقد و نظر کے مروّج اور روایتی پیمانوں سے ہٹ کر، ایک ذہین و با مطالعہ اور ذوقِ نقدِ شعر رکھنے والے نقاد کا اسلوب ہے، اسی لیے قاری کو اپنی انفرادیت کا احساس دلاتا ہے۔ "جہاتِ اقبال" اقبالیاتی تحقیق و تنقید کا ایک اعتبار قائم کرتی ہے، اور اس سے مطالعۂ اقبال کی بعض نئی سمتوں کی طرف اشارے ملتے ہیں۔ (رفیع الدین ہاشمی)

ادب القاضی: از ڈاکٹر محمود احمد غازی۔ ناشر: ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔ صفحات ۳۹۰

ادب القاضی سے کیا مراد ہے؟ ادب القاضی اسلام کا قانون عدالت و ضابطہ ہے۔ اس میں

نظامِ قضا' ثبوت' گواہی' دعویٰ اور اس کے متعلقات' مقدمات اور ان کی سماعت' فیصلہ کیسے کیا جائے' نیم عدالتی ادارے مثلاً احتساب' مظالم' اِفتا وغیرہ کے اہم مباحث شامل ہیں۔

علمِ فقہ کی اس شاخ پر ہمارا روایتی اسلامی لٹریچر تو مالا مال ہے لیکن اردو زبان میں نہ اس کی ضرورت پڑی اور نہ اس کے لیے تیاری کی گئی۔ نفاذِ شریعت کے مطالبوں کے ساتھ اس کی ضرورت تھی کہ اس کے تقاضے پورے کرنے کی بھی فکر کی جائے۔ ادارہ تحقیقاتِ اسلامی نے اس ضرورت کو محسوس کرکے کئی قابلِ قدر کام کیے ہیں۔ اسی سلسلے میں ڈاکٹر محمود احمد غازی نے بڑی محنت و کاوش سے یہ کتاب مرتب و مدوّن کی ہے جس کا دوسرا نظرثانی ایڈیشن ہمارے سامنے ہے۔ فاضل مرتب نے پہلے تو موضوع پر جامع اسکیم تیار کی' پھر جملہ مآخذ کو کھنگال کر' بہترین حصّوں کو منتخب کرکے ان کا خوبصورت ترجمہ کیا اور ذیلی عنوانات قائم کرکے انھیں ایک لڑی میں پرو کر پیش کردیا ہے۔

ابتدائی تین ابواب میں موضوع سے متعلق آیاتِ قرآنی' احادیثِ نبوی اور آثارِ صحابہ و تابعین کو مناسب ترتیب سے یکجا کردیا گیا ہے۔ باب چہارم دورِ فاروقی کی اہم عدالتی دستاویزات پر مشتمل ہے۔ پانچواں باب نظامِ قضا پر مذاہبِ اربعہ کی اہم اور بنیادی کتب سے ماخوذ ہے۔ چھٹا باب سماعتِ مقدمہ اور فیصلہ کے بارے میں ہے۔ ساتواں باب ادارہ افتا' ادارہ وکلا' ادارہ احتساب' ولایتِ مظالم اور ادارہ تحکیم کے بارے میں ہے۔ آخر میں مرتب کا ایک مقالہ "اسلام کا نظامِ احتساب" شامل کیا گیا ہے۔

کتاب کا انداز آسان اور عام فہم ہے۔ اسے پڑھنے اور سمجھنے کے لیے وکیل ہونا ضروری نہیں ہے' گو کہ بنیادی طور پر یہ کتاب کسی آنے والے دَور کے وکلا اور ججوں کے لیے ایک ناگزیر کتاب ہے۔ اگر یہ ایل ایل بی کے نصاب میں اب تک شامل نہیں کی گئی ہے تو اس پر افسوس ہی کیا جاسکتا ہے۔

اس کتاب کا ایک شاہکار باب "عرضِ مرتب" ہے جس کے مطالعے سے تبصرہ نگار جیسا ایک عام قاری بھی علمی دنیا کی سیر کرلیتا ہے' اور آج امتِ مسلمہ کو جو حقیقی مسائل درپیش ہیں ان کا ادراک بھی حاصل ہوتا ہے۔

اپنے موضوع پر نہایت اہم' اور اتنی اعلیٰ خوبصورت کتاب میں خاصی تعداد میں کمپوزنگ کی غلطیاں کچھ زیادہ ہی ناگوار محسوس ہوتی ہیں۔ (مسلم سجاد)

علامہ اقبال اور میرِ حجازؐ : از ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی۔ ناشر: بزمِ اقبال، کلب روڈ، لاہور۔ صفحات ۴۸۔ قیمت ۳۰ روپے۔

علامہ اقبال، عاشقِ رسولؐ تھے۔ ان کی زندگی سراپا سوز تھی۔ اقبال پر حضورِ اکرمؐ کا نام آتے ہی گریہ کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ ان کی طبیعت میں سوز و گداز کی یہ کیفیت اوائلِ عمر ہی سے موجود تھی۔

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے علامہ اقبال کی نظم و نثر سے ان کے عشقِ رسولؐ سے متعلق لوازمہ فراہم کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اقبال کے یہاں ابتدا میں روایتی نعت گوئی کا رجحان ملتا ہے لیکن بہت جلد ان پر حضورِ اکرمؐ کی پیغمبرانہ اور بشری عظمت واضح ہوگئی اور حضورِ اکرمؐ کی رحمت و شفقت کا پہلو ان کے لیے سب سے زیادہ جذب و کشش کا باعث بن گیا۔

ڈاکٹر ہاشمی نے اقبال کے عشقِ رسولؐ میں ان کے والدِ محترم کے اندازِ تربیت کو مؤثر عامل قرار دیا ہے۔ علامہ اقبال کے نزدیک محبتِ رسولؐ کا تقاضا یہ ہے کہ دینِ اسلام کی خدمت کی جائے۔ علامہ اقبال کا مدینہ منورّہ کا روحانی سفر، "ارمغانِ حجاز" کی صورت میں سامنے آیا۔ وفات سے کچھ عرصہ پہلے وہ حج کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ لیکن ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی، تاہم ان روحانی کیفیات کا بھرپور اظہار، "ارمغانِ حجاز" کی رباعیات میں ہوا ہے۔

ڈاکٹر ہاشمی کے اس مقالے میں پندرہ ذیلی عنوانات ہیں جن میں سے چند ایک یہ ہیں: محبتِ رسولؐ: تقاضائے ایمان، وَرَفَعۡنَا لَکَ ذِکۡرَکَ، اسمِ محمدؐ: اسمِ اعظم، اقبال اور دل بستگیٔ رسولؐ، شیخ نور محمد کا اندازِ تربیت، ابتدائی دور کا نعتیہ آہنگ، آپؐ کا روحانی فیض، محبتِ رسولؐ کا تقاضا: خدمتِ دین... اس تحقیقی مقالے میں بھی زبان و بیان کی چاشنی موجود ہے۔ (ظفر حجازی)

وضاحت

۱۔ ترجمان القرآن میں ترجیحاً دینی اور علمی کتابوں پر تبصرے شائع کیے جاتے ہیں۔

۲۔ تبصرے کے لیے کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں۔

۳۔ تبصرے کے لیے مطبوعات براہِ راست: مدیر ترجمان القرآن منصورہ، لاہور ۵۴۵۷۰ کو بھیجی جائیں۔

مدیر کے نام

اسماعیل قریشی ' عالمی تنظیم مسلم ماہرینِ قانون ' لاہور

ماہنامہ ترجمان القرآن کے مضامین اور آپ کے اشارات سے مولانا مودودیؒ کے فکری مشن کی تابناکی برقرار ہے۔ خاص طور پر رسائل و مسائل کے باب میں آپ کی فقیہانہ بصیرت نمایاں نظر آتی ہے۔

میں نے اور میرے کرم فرما جناب اے کے بروہی مرحوم نے موجودہ آئین و قانون پر مولانا کی تصانیف کے اثرات کا جائزہ لینے کا پروگرام بنایا تھا۔ لیکن بروہی صاحب کو موت نے مہلت نہ دی۔ استعماری قوانین کے اسلامائزیشن کے سلسلہ میں اعلیٰ عدلیہ میں مسلسل قانونی جدوجہد اور قادیانیت کے خلاف قانونی جنگ کی وجہ سے مجھے فرصت نہ مل سکی۔ لیکن اس بات سے قلب کو اطمینان حاصل ہوتا رہا ہے کہ یہ بھی سیّد مودودیؒ کے 'مشن' جو دراصل اسلام کا عالم گیر مشن ہے' کا حصہ ہے۔

لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) سیّد رفاقت ' راولپنڈی

ترجمان القرآن کو دیکھ کر ایسے محسوس ہوا جیسے کوئی دیرینہ دوست ' بچپن کا ساتھی مل جائے۔ میری اس میگزین کے ساتھ وابستگی پچپن سال سے اوپر کی ہوگی۔ میرے والد مرحوم و مغفور سیّد نادر شاہ برصغیر کی ان شخصیات میں سے تھے جنھوں نے ترجمان القرآن کو اس رسالہ کی ابتدا ہی سے باقاعدگی سے حاصل کرنا اور پڑھنا شروع کیا۔ جب میں بہت چھوٹا تھا تو میرے ذمہ یہ سعادت تھی کہ ترجمان القرآن کی کاپیوں کو ترتیب وار ' لائبریری کے ایک شیلف میں باقاعدگی سے لگاتا رہوں۔ اس صدی کے چالیسویں عشرہ کی ابتدا میں مَیں نے ترجمان القرآن پڑھنا بھی شروع کردیا۔ اپنی وضع قطع ' لکھائی چھپائی اور آرٹ پیپر پر موتیوں جیسے جڑے ہوئے فقرات ایک قاری کو جو ابھی ناپختہ تھا اپنی طرف کھینچ لائے۔ اس پر سیّدنا مرحوم کا شگفتہ قلم ' خوبصورت تحریر اور علمیت کے بحرِ بے کراں میں ڈوبے ہوئے خیالات ایک عجیب رنگ پیدا کرتے۔ میں اکثر سیّدنا کی تحریروں کو باآواز بلند ' نظم کی صورت میں پڑھتا۔ کیونکہ ان کی نثر میں قافیہ اور ردیف سے بلند ہو کر ' نظم کی جاذبیت اور روانی ہوا کرتی۔ میرا یہ طریقہ اس وقت جاری رہا جب تک میں ایم اے کا طالب علم تھا۔ پھر ۱۹۵۱ میں مَیں فوج میں کمیشن حاصل کرچکا تھا اور ۱۹۵۳ میں والد بزرگ وار وفات پا گئے۔ ان کے اس دنیا سے اٹھنے کے ساتھ ہمارے آبائی گھر میں ترجمان القرآن آنا بند ہوگیا اور فوج میں ان دنوں سیّدنا کی تحریریں تخریب کاری لٹریچر سمجھی جاتی تھیں۔ لہٰذا فوجی سرکل میں بھی اس قسم کے رسالے سے ناطہ ٹوٹ گیا۔

ڈاکٹر عنایت اللہ فیضی ' گورنمنٹ کالج' بونی' چترال

میں ایک روایتی مکتوب نگار کی طرح آپ کو مبارک باد دے کر اس تحریر کو پیٹنا نہیں چاہتا بلکہ چند امور کی طرف آپ کی توجہ مبذول کراتا ہوں۔ ۱- ترجمان القرآن بلاشبہ ایک علمی مجلہ ہے اور اس کی یہ شناخت برقرار رہنی چاہیے' مگر زبان کو سلیس اور عام فہم بنا کر بھی یہ شناخت برقرار رکھی جاسکتی ہے۔ ۲- ملکی حالات اور تازہ ترین عالمی واقعات کے حوالے سے رواں اور شستہ زبان میں مستقل تحریریں آنی چاہئیں۔ ۳- اشارات کو ہر ماہ کسی اہم واقعہ پر جماعت کا نقطۂ نظر' غیر مبہم اور سلیس زبان میں پیش کرنے کے لیے وقف کرنا چاہیے۔ اس میں کوئی خوب صورت ادب پارہ پیش کرنے سے ابلاغ کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔

محمد یٰسین مسلم ' شجاع آباد

خمینی صاحب کی قیادت میں تحریکِ اسلامی' ایران میں انقلاب لانے میں اس لیے کامیاب ہوئی کہ اس نے جو دین کا تصور دیا تھا اس میں معاشی انصاف اور خوشحالی کو نشانِ منزل قرار نہیں دیا بلکہ خود منزل قرار دیا تھا۔ الجزائر کی اسلامی تحریک نے اسلامک فرنٹ کے فورم پر مادیت کا کچھ تو تصور دیا تھا جو وہاں کامیاب ہوئے۔ آپ دیکھیں کہ انقلاب برپا کرنے والی مذہبی تحریکوں نے معاشی و مادی پہلو کو جو اہمیت دی وہ کس انداز میں دی تھی۔ آپ کا تصورِ مادیت --- معاشی ترقی اور زندگی کی بہتری' لازمی نشان منزل ہے --- قرآن کے تصورِ مادیت سے مختلف ہے' اور آپ اپنے اس تصورِ مادیت سے عالمی سامراج کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔

مقبول الرحیم مفتی ' لاہور

سید مودودی مرحوم کے بعد جناب عبدالحمید صدیقی مرحوم نے جس طرح پرچے کے علمی معیار کو برقرار رکھا' آپ کو اس معیار تک پہنچنے کے لیے ابھی کافی محنت کی ضرورت ہے۔

عطیہ کوثر ' گوجرانوالہ

فہم حدیث "کلام نبویؐ کی صحبت میں" بڑا اچھا سلسلہ ہے۔ مارچ کے شمارے میں احادیث کا انتخاب بڑا برمحل ہے' لیکن اس مرتبہ بعض احادیث کی وضاحت بالکل نہیں کی گئی (رسائل و مسائل میں جس کا سبب معلوم ہوا)۔ لیکن میری آپ سے درخواست ہے کہ چند فقرات تشریح کے ضرور ہونے چاہئیں۔ اگر ساتویں اور آٹھویں احادیث کے الفاظ پر اعراب ہوتے تو الفاظ کو یاد کرنے میں آسانی ہوتی۔

ڈاکٹر غلام فرید بھٹی ' بہاول پور

شمارے کی شکل و شباہت اور اس کے مندرجات کو دیکھ کر بہت مسرت ہوئی۔ امید ہے ترجمان کی نئی پالیسی کو تحسین کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ میں تجویز پیش کرتا ہوں کہ ترجمان القرآن میں قارئین کی رائے یا "آپ کی رائے" کے عنوان سے چند صفحات مخصوص کرلیں جس میں اپنے مخالفین اور موافقین کی رائے کو ضرور شائع کریں۔

REGD. NO. L 5340

PHONE : 7234014
7236665

MONTHLY TARJUMAN-UL-QURAN LAHORE